# قومِ زمان

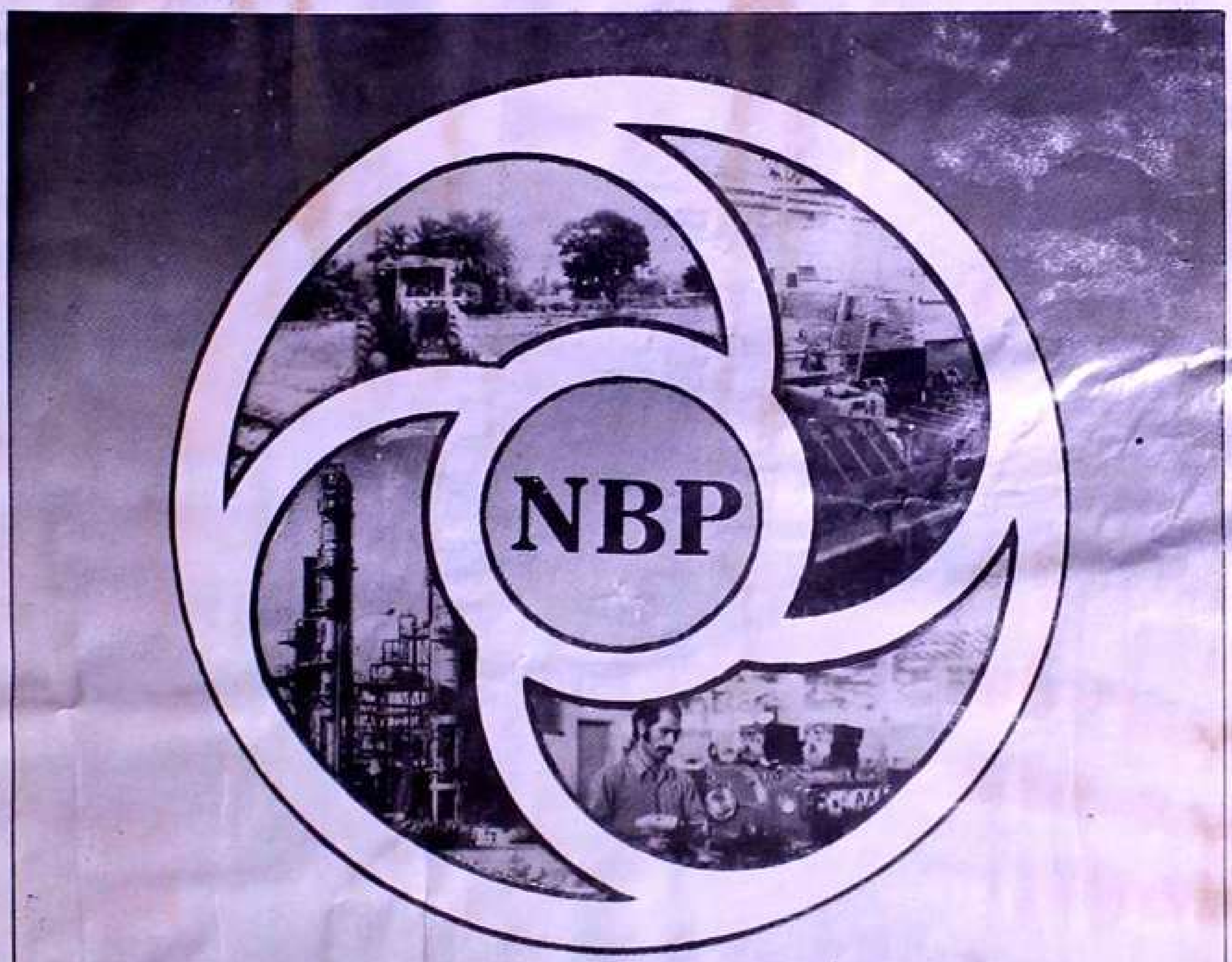


# ہر پہلو سے ممتاز بینک

- ۴۵ سال سے ترقی کی راہ پر گامزن
- قومی ترقیات اور ملکی مالیات میں کلیدی کردار
- اندرون ملک و بیرون ملک وسیع برانچ نیٹ ورک
- ملکی اور غیر ملکی کرنسی کا مکمل بینکاری نظام
- ڈپازٹس پر زیادہ منافع کی ادائیگی
- جدید ترین سہولتوں سے آراستہ
- آپ کے قیمتی وقت کا مکمل احساس

## ہر پاکستانی بینک سے زیادہ مُنافع حاصل کرنے کا ریکارڈ

بینکاری کی تمام خدمات کے لیے
کامل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجیے۔

**نیشنل بینک آف پاکستان**
قومی ترقی۔ قومی بینک

UNITED

PID-I-26/95

ماہنامہ

# قومی زبان

کراچی

بانی: بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

جاری شدہ: پاکستان میں ۱۹۴۸ء

قومی زبان نومبر ۹۵ء جلد: ۶۷، شمارہ ۱۱


## مضمون نما


| | | |
|---|---|---|
| ممتاز حسن میرے دادا جان | شازیہ حسن بنت امتیاز حسن | ۶ |
| قطعہ | مختار اجمیری | ۱۹ |
| غزل | اختر لکھنوی | ۲۰ |
| اختر لکھنوی شخصیت اور شاعری | اختر لکھنوی | ۲۱ |
| اقبال کی شاعری کی صوتی فضا | شاہدہ یوسف | ۲۷ |
| انتظار حسین کا "آگے سمندر ہے" | پروفیسر ریاض صدیقی | ۳۹ |
| ضیاء الدین پروانہ | پروفیسر شفقت رضوی | ۴۹ |
| گلہائے رنگ رنگ | | |
| ایک میز ایک میز ہے | پیٹر بخسل / منیر الدین احمد | ۵۹ |
| روشنی میں جلتے ہوئے | آکٹو یو پاز / انور زاہدی | ۶۳ |
| باغِ آشنائی | حسین فرازمند / معین نظامی | ۶۴ |
| رفتارِ ادب | ثناء الحق صدیقی / پروفیسر عتیق احمد / اس | ۶۷ |
| کچھ وقت، غیر ملکی اُردو کتابوں کے ساتھ | ڈاکٹر انور سدید | ۷۷ |
| گرد و پیش | | ۸۱ |
| نئے خزانے | ڈاکٹر وفا راشدی | ۸۹ |



اداره تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

مُدیر

ادیب سہیل

بدلِ اشتراک

فی پرچہ ـــــ ۸ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ/ ۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ/ ۲۵ ڈالر



انجمن ترقی اُردو پاکستان

شعبۂ تحقیق

ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰

فون: ۴۶۱۴۰۶ - ۴۹۷۳۲۹۶

# حبیب بینک کریڈٹ کارڈ

## اب ایک نئے انداز میں

ہم انتہائی مسرت کے ساتھ آپ کو نئے اور بہتر کریڈٹ کارڈ سے متعارف کرا رہے ہیں۔

حبیب بینک ملک کا پہلا بینک ہے جس نے ۱۹۶۶ء میں پاکستان میں کریڈٹ کارڈ اسکیم کو متعارف کرایا۔ اور صرف چند ہی سالوں میں یہ اسکیم بے حد مقبول ہوگئی۔ آج حبیب بینک کریڈٹ کارڈ رکھنے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہے اور پورے ملک میں ۱۰۰۰ سے زائد ادارے جس میں ایئر لائن، پٹرول پمپ، ہوٹل، ریسٹورنٹ، ہسپتال، ڈیپارٹمنٹل اسٹورز، جنرل مرچنٹس وغیرہ شامل ہیں اسے قبول کرتے ہیں۔

ہمارے کریڈٹ کارڈ رکھنے والے اسے آزادانہ استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔ سفر ہو یا خریداری آپ صرف بل پر دستخط کریں۔ باقی کام ہماری ذمہ داری ہے۔

نقد رقوم رکھنا غیر محفوظ ہے، اپنا کریڈٹ کارڈ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں۔ اپنی قریبی شاخ سے رابطہ کر کے نیا کارڈ حاصل کریں۔ موجودہ کارڈز اپنی مدت ختم ہونے تک کارآمد رہیں گے۔

بہتر خدمت کی روایت

## حبیب بینک لمیٹڈ


PID (Islamabad)

اُردو ادب کو انیسویں صدی نے مرزا غالب اور بیسویں صدی نے علامہ اقبال دیے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارا ادب مسلسل دو صدیوں تک نابغۂ روزگار سے بھرا پُرا رہا۔ کسی زبان و ادب میں کم ایسا ہوا ہے کہ مسلسل دو صدیوں تک اس کے ایوان میں عظمت کا نشان اِس طرح بلند رہا۔ صرف یہی نہیں آنے والی بہت سی صدیوں میں بھی ان عظیم ناموں کے طفیل اُردو ادب کے باثروت ہونے کا احساس زندہ و تابندہ رہے گا۔ اکیسویں صدی دستک دے رہی ہے، توقع رکھنی چاہیے کہ یہ صدی بھی کسی نہ کسی نابغۂ روزگار ادیب و شاعر کی آمد کی خوش خبری اپنے لوگوں کو سنائے۔

یوں تو ہم سال بھر علامہ اقبال کی یادوں سے ذہنوں کو تر و تازہ رکھتے ہیں۔ ہمارے پیشِ نگاہ ان پر لکھی گئی کوئی نہ کوئی کتاب یا کوئی نہ کوئی مقالہ ہوتا ہے۔ اِس کے باوجود ہر سال نومبر کے مہینے میں علامہ اقبال کی سالگرہ اور اپریل کے مہینے میں یومِ وفات مناتے ہیں۔ اِن مواقع پر اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سیمنار اور جلسوں کا اہتمام کرتے ہیں، مشاہیر ادب سے علامہ کی شخصیت، فن اور فلسفہ پر مقالات پڑھوائے جاتے ہیں، اور کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ماہنامہ قومی زبان بھی علامہ کی یاد تازہ کرنے میں اِن دونوں مواقع پر کچھ نہ کچھ اہتمام کرتا ہے زندہ قوموں کی نشانی یہی ہے کہ وہ اپنے محسنین ادب کو یاد رکھیں اور ان کے ذکرِ خیر سے آنے والی نسلوں کو آگاہ کرتی رہیں۔

نئی' مفید ترین

# سُعالین

گزشتہ ساٹھ سال سے انکشافاتِ حاضرہ اور انکشافاتِ جدیدہ سے ہم آہنگ
کھانسی نزلہ وزکام کے لیے سب سے مفید اور سب سے موثر کھانسی کی ٹکیاں

انکشافاتِ ماضی اور انکشافاتِ جدیدہ نے ہر طرح ثابت کر دیا ہے کہ نباتات ہی ہیں جو جسمِ انسانی میں کوئی غیر طبعی ہنگامہ آرائی کیے بغیر شفائے امراض کا سامان کرتی ہیں۔

ہمدرد اس اندازِ فکر کا پُرجوش حامی رہا ہے۔ ملکی اور عالمی سطح پر۔ تحقیقاتِ نباتات کو ہمدرد نے اپنا موضوع بنائے رکھا ہے۔
آج ساری دنیا بھرپور اعترافات کے ساتھ نباتات سے شفائے امراض پر متوجہ ہو چکی ہے۔ اسی لیے شعالین جس طرح پاکستان میں ایک بہترین دوائے شافی کے طور پر مقبول ہے اسی طرح دنیا بھر میں شعالین کو قبولِ عام حاصل ہے۔

خاص طور پر تیار کردہ نئی اسٹرپ پیکنگ تاکہ شعالین کے نازک ضروری اجزاء مکمل طور پر محفوظ رہیں
اور استعمال پر شعالین تیر بہدف ثابت ہو۔

شعالین جوشاندے کا جوہر ہے۔
تین ٹکیاں گرم پانی میں ڈال کر
نوش جاں کیجیے۔ نزلہ، زکام اور
کھانسی سے راحت پایئے۔

جب کھانسی کا ٹھسکا ہو، ایک ٹکیہ
شعالین منہ میں ڈال کر چوسیے۔
منٹوں میں راحت پایئے۔ ہر قسم کی
کھانسی کے لیے مفید ترین۔ شعالین

مدینۃ الحکمۃ
تعلیم، سائنس اور ثقافت
کا عالمی منصوبہ۔
آپ ہمدرد دوست ہیں۔
اعتماد کے ساتھ مصنوعات
ہمدرد خریدتے ہیں۔
جائز منافع ہیں ادا کو اس شہر
علم و حکمت کی تعمیر میں لگ
رہا ہے۔ اسی کی تعمیر میں
آپ بھی شریک ہیں۔

ہمدرد

Adarts-SUA-1/93

ڈاکٹر ممتاز حسن



اختر لکھنوی

قومی زبان (٦) نومبر ۱۹۹۵ء

# ممتاز حسن، میرے دادا جان

شازیہ حسن بنت امتیاز حسن
ترجمہ: صابر صدیقی

۲۹ اکتوبر ۱۹۷۴ء کے دن، پیپی ڈیل اسکول کی یونیفارم میں ملبوس بچّے قبرستان میں ایک تیار قبر تک جانے والی تنگ روش کے ساتھ سنجیدگی و متانت سے قطار در قطار کھڑے تھے۔ اُس دن اسکول کی گورننگ باڈی کے سابق صدر کو سُپردِ خاک کیا جانا تھا۔ جوں ہی جنازہ قبر میں اُتارا گیا، ایک چاق و چوبند اسکاؤٹ دستہ نے اپنے بگل بجا کر ممتاز حسن کو الوداع کہا۔

جناب ممتاز حسن کو فوت ہوئے آج بیس برس ہو گئے، بہت لوگ اُن کے نام کی سڑک پر گاڑیاں دوڑاتے پھرتے ہیں انھیں یہ تک یاد نہیں کہ وہ کون تھے؟ سوالات کرتے ہیں کہ وہ کون تھے؟ اُنھوں نے کیا کہ کارنمایاں انجام دیے تھے۔ میں نے اُن سوالات کے جوابات معلوم کرنے کے لیے تحقیق کی اور الجھن میں پڑ گئی۔ ممتاز حسن کا شمار اُن لوگوں میں نہیں ہوتا جو صرف ایک بڑا کام انجام دیتے ہیں اور پھر اُسی کی وجہ سے یاد رکھے جاتے ہیں۔ وہ تو اتنے زیادہ کاموں میں دخیل ہو گئے تھے کہ اُن کے ہر ایک ذوق اور کارنمایاں پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ میں ذیل میں وہ نام دینا چاہوں گی، ممتاز حسن ماہر آثارِ قدیمہ، ممتاز حسن ماہر اقتصادیات اور بینکار، ممتاز حسن، انشا پرداز اور ادیب، ممتاز حسن ایک اسکالر (ماہر تعلیم)، ممتاز حسن ہمیشہ ایک طالب علم رہے، ممتاز حسن ایک براڈکاسٹر، ممتاز حسن دوستوں کے دوست، اور ممتاز حسن ایک کلاؤن (CLOWN)۔ قبل اس کے کہ آپ کسی اُلجھن میں پڑ جائیں، بہتر ہوگا کہ اس بات کو یہیں ختم کر دوں۔ اور محبت سے اس مقالہ کو "ممتاز حسن۔ میرے دادا جان" کا عنوان دوں۔

ممتاز حسن ۱۶ اگست ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوئے، وہ اپنے والدین کے بڑے لڑکے تھے ایف سی کالج لاہور سے ایم اے کرنے کے بعد وہ پبلک سروس کمیشن، نئی دہلی کے منعقدہ انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے امتحان میں بیٹھ گئے۔ ان کے والد محمد حسن ان دنوں پنجاب ہائی کورٹ کے جج تھے۔ ممتاز حسن خود بھی قانون کے مطالعہ کے گرویدہ تھے۔ چنانچہ ایم اے اور آئی اے اے ایس (IAAS) کے نتیجہ کے درمیانی وقفے میں اُنھوں نے اُسے بھی پاس کر لینے کا ارادہ کر لیا۔ جب نتیجہ کا اعلان ہوا تو وہ پنجاب یونیورسٹی سے فرسٹ ایل ایل بی کا امتحان پاس کر چکے تھے۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں اُنھوں نے انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس میں شمولیت اختیار کر لی۔ اوپن آل انڈیا مقابلے میں خالصتاً میرٹ کی بنیاد پر کامرانی کے ساتھ امتحان پاس کرنے کے بعد (واضح رہے وہ مسلم کوٹہ سے نہیں آئے تھے) فوراً ہی محمد حسن پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے غیر منصفانہ طرزِ عمل کی بنا پر قبل از وقت جبری ریٹائر ہو گئے تھے۔ چونکہ ممتاز سب سے بڑے تھے۔ اس لیے اس موقعہ پر اپنے والد کا دست و بازو بن کر اہلِ خاندان کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹا کر انھوں نے مکمل طور پر اپنا فرض ادا کیا اور تا زندگی ضرورت پڑنے پر ہمیشہ اپنے والد کو دستیاب رہے۔

پانچ سال بعد وہ ڈپٹی کمپٹرولر (اکاؤنٹنٹ جنرل) سندھ مقرر کر دیے گئے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک وہ اس عہدہ پر سب سے کم عمر افسر تھے۔ خود حکومت نے اُن کی خدمات کو سراہتے ہوئے اُن کا تبادلہ محکمہ مالیات (فنانس منسٹری) نئی دہلی کر دیا۔

۱۹۳۹ء میں ممتاز حسن سر جریمی میزمین (SIR JEREMY RAISMAN) کے پرائیوٹ سیکرٹری مقرر ہو گئے۔ (جو ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک انڈیا کے وزیر مالیات تھے) اُن کی قربت میں اُنھیں فارسی ادب، خاص طور پر فارسی شاعری سے لگاؤ پیدا ہوا۔ اپنے افسر کی پابندیٔ وقت کا ساتھ دینے کے لیے انھوں نے اپنی گھڑی معیاری وقت سے پندرہ منٹ آگے کر لی تھی، کچھ سال بعد جب جناب لیاقت علی خاں مخلوط حکومت میں وزیر مالیات مقرر ہوئے تو اُنھوں نے ممتاز حسن کو اپنا سیکرٹری مقرر کر لیا۔ دسمبر ۱۹۴۶ء میں جب وہ مسٹر جناح، لیاقت علی خاں اور کے ایچ خورشید کے ہمراہ انگلستان گئے تو بھی وہ قائدِ اعظم کے قدم بہ قدم چلنے کے لیے اپنی گھڑی آدھ گھنٹہ آگے رکھتے تھے۔

لیاقت علی خاں کے پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر ممتاز حسن کو غیر منقسم ہندوستان کے وزیر مالیات (لیاقت علی خاں) کی بجٹ تقریر کے کئی حصے لکھنے کا تاریخی موقع ملا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی (MEMOIRS) آپ بیتی، انڈیا ونس فریڈم (INDIA WINS FREEDOM) میں لکھتے ہیں کہ لیاقت علی خاں خوش قسمت تھے کہ اُنھیں اپنے ارد گرد قابل ترین مسلم ماہرین مالیات کے ایک گروپ کی رفاقت نصیب تھی جس نے بجٹ کی بے مثال کامیابی کی دھوم مچادی تھی اِن قابل ترین ماہرین مالیات میں ایک نام ممتاز حسن کا تھا۔

وزارتِ مالیات میں وہ اتنا اہم کام انجام دے رہے تھے کہ وہ ہمیشہ اپنے پاس رقم رکھنا بھول جاتے تھے۔ باقاعدگی سے یہ بات اُن کی عادت بن گئی۔ مگر کوئی شخص حتیٰ کہ ان کی اہلیہ بھی (جن کے لیے اُن کے دل میں بڑا عزت و احترام موجود تھا) اُنھیں اپنی جیب میں اگر کچھ نہیں تو ایک روپیہ رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھیں۔ حسب معمول ایک دن ممتاز حسن بغیر نقدی کے تھے اُن کا سامنا ایک فقیر سے ہو گیا۔ اُنھوں نے فقیر سے کہا کہ اُن کے پاس اُسے دینے کے لیے فی الحال کچھ بھی نہیں۔ اور اُسے چیک دینا مناسب نہیں سمجھتے۔ فقیر نے رحمدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جیب سے ایک سکہ نکالا اور ممتاز حسن کو پیش کر دیا۔ وہ فٹ پاتھ پر حیران و ششدر کھڑے رہ گئے۔

۱۹۴۷ء میں کسی وقت قائدِ اعظم کو ممتاز حسن کی توانائیوں کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا اس لیے اُنھوں نے لیاقت علی خاں اور غلام محمد کو حکومتِ پاکستان میں اُنھیں انتہائی اہم ذمہ داریاں سونپنے کی ہدایت کر دی تھی۔ یہ بات ۱۹۶۱ء میں لندن میں موجود سر وکٹر ٹرنر (SIR VICTOR TURNER) پاکستان کے پہلے سیکرٹری مالیات نے امتیاز حسن کو بتائی تھی۔ تقسیم (ہند) کے فوراً بعد ممتاز حسن کو مالیات اور بینکاری کی خصوصی ٹریننگ کی غرض سے ریزرو بینک آف انڈیا اور بینک آف انگلینڈ میں بھیج دیا گیا جس نے حکومت میں ان کی اجارہ داری میں بہت ہی اہم پوزیشن تک رہنمائی کی۔ کچھ وقت کے لیے وہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے گورنر بھی رہے۔

اپنے سرکاری فرائض کے علاوہ، ممتاز حسن کلچر اور ایجوکیشن کے قومی اور بین الاقوامی دونوں میدانوں میں بھی انتہائی سرگرم عمل رہے۔ وہ (۳۲) تنظیموں، بشمول پیپی ڈیل اسکول کی گورننگ کمیٹی کے صدر، چیئرمین، بانی، ٹرسٹی اور رکن تھے، یعنی ۱۹۵۶ء (جب اسکول قائم ہوا تھا) سے ۱۹۷۳ء تک (جب اسے قومیا لیا گیا تھا) ۱۹۷۳ء میں سرسید گرلز کالج کے قومیائے جانے تک اُس کی گورننگ باڈی کے رکن رہے۔ پی ای سی ایچ ایس (PECHS) گرلز اسکول کی گورننگ باڈی کے بھی، ۱۹۷۳ء میں قومیائے جانے تک رکن رہے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۰ء تک اُردو ڈیولپمنٹ بورڈ کے چیئرمین رہے۔ ۱۹۵۷ء سے اپنی وفات تک

پاک جرمن فورم، کراچی کے چیئرمین رہے، پاک امریکن کلچرل سینٹر (PACC) کے چیرمین، برٹش کونسل کراچی کے بانی اور تاحیات رکن رہے، پاک ایرانین کلچرل ایسوسی ایشن کے چیئرمین اور میوزیم ایسوسی ایشن آف پاکستان کے صدر بھی رہے۔

فرینڈشپ، کلچر اور ایجوکیشن کے فروغ کے لیے اُن کی ہمہ گیر کوششوں کو دنیا بھر میں سراہا گیا۔ اُس کا اندازہ حسب ذیل اعزازات و ایوارڈز سے ہوتا ہے۔

| | |
|---|---|
| (۱) ستارۂ پاکستان | ۱۹۵۸ء |
| (۲) نائٹ کمانڈر آف آرڈر آف میرٹ جرمنی | ۱۹۵۹ء |
| (۳) نشان سپاس ایران | ۱۹۶۳ء |
| (۴) نائٹ گرینڈ کراس، آف دی آرڈر آف میرٹ، جرمنی | ۱۹۶۸ |
| (۵) گوئٹے میڈل، جرمنی | ۱۹۶۸ء |
| (۶) ایل ایل ڈی آنریس کاز (HONOURIS CAUSA) آف دی یونیورسٹی آف پنجاب | ۱۹۶۸ء |
| (۷) گولڈ میڈل آف میرٹ فار کلچر، اٹلی | ۱۹۶۹ء |

۱۹۶۸ء میں جب ممتاز حسن کو یونیورسٹی آف پنجاب کی جانب سے (LLD) ایل ایل ڈی، کی آنریری ڈگری عطا کی گئی تو ایف سی کالج لاہور میں انگریزی کے پرانے استاد کو بھی کالج کے پرنسپل کے بطور ریٹائرمنٹ پر اسی ڈگری سے نوازا گیا۔ اس موقع پر برابر کھڑے ہوئے اِن دونوں حضرات کی تصاویر کھینچی گئیں مگر ممتاز حسن مطمئن نہ ہوئے۔ وہ اب بھی خود کو جناب سنک لیئر (SINCLAIRE) کا ادنیٰ طالب علم سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ طالب علم کا مقام تو استاد کے قدموں میں ہوتا ہے۔ دوسرا فوٹو ممتاز حسن کے زور دینے پر کھینچا گیا۔ اس مرتبہ واقعی وہ مسٹر سینک لیئر کے قدموں میں بیٹھے تھے۔ اپنے استاد کے لیے محبت و احترام، اُن کے اس جذبے سے عیاں ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ انڈو پاک مشاعرہ کی صدارت کے دوران ایک شاعر نے اپنی نظم پڑھنے کے بجائے نعت پڑھ دی، ممتاز حسن نے مشاعرے کی کارروائی اُس وقت روک دی جب شاعر کو یہ کہتے سنا گیا کہ حضرت پیغمبر صلعم کا ذکرِ پاک کرنے کے بعد کسی کے لیے ٹوٹے ہوئے دل یا بہار میں پھول، کا ذکر کرنا درست نہیں۔ مدعو شعراء کو صرف نعت یا حمد پڑھنے کی اجازت دی گئی۔ چونکہ اس امر کے لیے کوئی تیاری کر کے نہیں آیا تھا۔ لہذا یہ عظیم الشان مشاعرہ بیس منٹ میں ختم ہو گیا۔ اور شاعر حضرات، "شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر" پڑھتے ہوئے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جس کا مطلب ہے کہ ملک کی حفاظت کے لیے ہتھیار پہلے، اور کسی موسیقی وغیرہ سے محفوظ ہونا بعد کی بات ہے۔

ممتاز حسن کو علامہ اقبالؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ اُنھوں نے یہ شعر ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل جناب زیڈ اے بخاری کی اُس مسل پر تحریر کر دیا تھا جسمیں پرانے آلاتِ موسیقی کی بجائے نئے آلاتِ موسیقی کے لیے مالی منظوری کے حصول پر زور دیا گیا تھا۔ بعد کو یہ مسل جناب زیڈ اے بخاری نے اپنے دفتر کے نوٹس بورڈ پر لگا دی تھی۔ جن لوگوں کو آلات کی کوالٹی کے بارے میں شکایتیں تھیں۔ یہ شعر پڑھنے کے بعد از خود حکومت کی ترجیحات کے بارے میں بہت کچھ جان گئے۔ اِس لیے وہ بالکل خاموش ہو گئے۔

اپنی اتنی ذمہ داریوں کے باوجود وہ اب بھی ایک گھریلو شخصیت تھے اور ممکنہ حد تک بیشتر وقت اپنے اہلِ خاندان کے مابین گزارتے تھے۔ اگست ۱۹۶۷ء میں نیشنل بینک آف پاکستان کے مینیجنگ ڈائرکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد ان کے

پوتے پوتیاں خود اُن کے اپنے بچوں کی نسبت، اُن کے وقت اور توجہ کے حصول میں بہت زیادہ خوش قسمت ثابت ہوئے تھے۔ ممتاز حسن کو بھی علم ہو گیا کہ بچوں سے ہنوز بے شمار باتیں سیکھنا باقی ہیں۔ اُن کا بچپن گویا واپس لوٹ آیا تھا۔ وہ میرے بڑے بھائی کا کھلونا پیانو بجانا پسند کرتے تھے۔ پہلی کوشش میں اُنھوں نے اُسے بے سُرا اور دوسری کوشش میں اُسے بالکل ناکارہ کر دیا۔ مجھے اپنی خوش بختی پر شبہ نہیں۔ حسب معمول وہ مجھے گرامر اسکول کے کِنڈرگارٹن سیکشن سے لینے آتے، کبھی ناکام نہ رہے۔ اُن کی گھڑی پہلے کی طرح کام کرتی تھی، دادا جان اور اُن کی پوتی یا تو جناب ابنِ انشا کے دفتر یا مارننگ نیوز کے دفتر یا پھر کسی اور دفتر چلے جاتے، ہمارے ساتھ کولڈ ڈرنک چسکی لے لے کر پیتے رہتے، ہم آپس میں بڑی پلو فائٹس (PILLOW FIGHTS) کیا کرتے۔ میں جتنی بار چاہتی تاک تاک کر اُنھیں تکیہ مارتی، جواب میں وہ تکیہ مارنے کی ناکام کوشش کرتے،

یہ دیکھتے ہوئے کہ اُنھوں نے بے حد مصروف زندگی گزاری تھی، ان کے ریٹائرمنٹ کے دن تمام اہلِ خانہ تناؤ کھنچاؤ کے عالم میں رہے۔ اُن پر یہ خوف غالب رہا کہ ممتاز حسن دفتر سے غمگین اور رنجور آئیں گے۔ اُن کی دلجمعی کی خاطر ایک سالگرہ پارٹی کا اہتمام کیا گیا۔ مگر جس کی خاطر سالگرہ منائی جا رہی تھی، اُسے اِس کی چنداں ضرورت نہ تھی بلکہ ایک اُچھلتے کودتے، ناچتے اور خوش و خرّم ممتاز حسن کو دفتر سے آتا دیکھ کر تمام اہلِ خانہ حیران رہ گئے۔ وہ خوش اس لیے تھے کہ اب ساٹھ سال کے ہو کر ملازمت سے فارغ ہو گئے تھے۔ ریٹائرمنٹ کا مطلب تو اُن کے لیے یہ تھا کہ اب وہ دوسرے کاموں پر توجہ دے سکیں گے مثلاً قانون کا مطالعہ.....

اُنھیں اپنی دسترس میں ہمہ قسم کی زبانیں سیکھنے سے دلچسپی تھی۔ حالانکہ وہ پہلے ہی سے انگریزی، اردو، فارسی، عربی، جرمن، فرانسیسی، سندھی اور پنجابی زبانیں روانی سے بول لیتے تھے، ریٹائرمنٹ کے بعد اُنھوں نے اپنی افغان بہو یعنی میری والدہ سے پشتو سیکھنے کا ارادہ کیا ہر شام ایک فرمانبردار طالب علم کی طرح ایک پینسل، ایریزر (ERASURE) اور ایک نوٹ بک ایک ہاتھ میں لیے اپنے استاد کے سامنے سبق لینے کے لیے دوزانو بیٹھ جاتے۔

زندگی میں کسی موقع پر ایک ہندو جوتشی نے ان کی جنم پتری (زائچہ) تیار کیا تھا۔ جسے ایک یا دو بار پڑھا گیا ہوگا پھر اُسے ممتاز حسن نے پرانے کاغذوں میں پھینک دیا۔ جنم پتری میں اُن کی زندگی کے اہم واقعات کے بارے میں بہت سی سچی باتیں خصوصاً زندگی کے ۶۸ ویں برس میں ان کی موت واقع ہو جانے کی بالکل ٹھیک پیش گوئی کی گئی تھی۔ اگرچہ اُنھیں علم نجوم پر کبھی یقین نہ تھا۔ لیکن موت کے بارے میں یہ پیش گوئی ان کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہی۔ اپنی موت سے دو ماہ قبل، مذہب اور امن پر بروسیلز میں منعقدہ دوسری عالمی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے جاتے ہوئے انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے امتیاز سے مسکراتے ہوئے کہا تھا، جو انھیں الوداع کہنے گئے تھے،

"ملک سے باہر اگر میرا انتقال ہو جائے تو تم میری میّت پاکستان واپس لاؤ گے اور اس بات کا خیال رکھو گے کہ مجھے تمھاری ماں کے پہلو میں دفن کیا جائے" یہ اُن کا حکم تھا..... وہ بہ حفاظت گھر واپس آ گئے۔ لیکن مرنے سے ایک ہفتہ قبل اُنھوں نے اپنے بہت سے دوستوں سے ملاقاتیں کیں اور ان سے استدعا کی کہ اگر کبھی انجانے میں اُن کی ذات سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو یا اُنھوں نے کسی کا دل دکھایا ہو تو وہ لوگ اُنھیں معاف کر دیں۔ اُن کے بہترین دوستوں میں سے ایک دوست سیّد ہاشم رضا نے پوچھا کہ آخر وہ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ تو جواب میں ممتاز حسن نے جنم پتری کی پیشن گوئی کا حوالہ دیا۔

جب سے میں نے بولنا سیکھا تبھی سے میں اُن کے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ وہ اپنے بیرونی سفر سے واپسی پر ایک بولتی اور چلتی پھرتی گڑیا لادیں چونکہ ان کی جیب میں ہمیشہ سے ایک قلیل رقم ہوتی تھی اس لیے میرے دادا جان میرے لیے گڑیا نہ لا سکے، اُس کی بجائے وہ میرے لیے بہت سی مٹھائیاں اور کتابیں ساتھ لے آتے۔ اپنے سوٹ کیس سے گم ہو جانے والی گڑیا کے بارے

میں میرے خوف زدہ کرنے والے سوالات سنتے اور مسکرا دیتے، میرے منہ میں ایک ٹافی رکھتے اور یہ کہتے ہوئے کہ گڑیا تو ابھی راستے میں ہے، وہ میرے آنسو پونچھ دیتے۔ اُن کے تصور میں، میں بھی ایک چلتی پھرتی اور بولتی گڑیا تھی۔ جس کے گم ہو جانے کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ بچے اُمید کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اس لیے ہر بار کسی ملک سے واپسی پر میں ان کی اس کہانی پر یقین کر لیتی۔ بروسیلز کے آخری سفر میں انھوں نے بالآخر وہ گڑیا خرید کر مجھے دے دی تھی۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو نجومی کی پیش گوئی کے عین مطابق ممتاز حسن اِس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اپنے ایک دوست کے مکان پر وہ اپنی کار میں سوار ہونے کو تھے کہ پھسل گئے اور کار کے فرش سے ٹکرا کر اُن کی کنپٹی کو ضرب پہنچی، فوراً ہی انھیں اسپتال لے جایا گیا لیکن راستے میں وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ساری زندگی اُنھیں اپنی قانونی تعلیم مکمل کرنے کی خواہش رہی لیکن اُن کی شدید مصروفیات مانع رہیں۔ اپنی موت کے دن وہ ایل ایل بی فائنل کے امتحان میں بیٹھنا چاہتے تھے لیکن وہ امتحان دوسرے طلبہ کے شدید اصرار پر ملتوی کر دیا گیا۔ ممتاز حسن امتحان ملتوی ہونے پر ناخوش تھے۔ انھوں نے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو فون کیا اور پوچھا تھا کہ اُنھوں نے طلبہ کے مطالبات کیوں مان لیے جبکہ خود ان کی تیاری مکمل تھی۔ لیکن یہ التوا فیصلہ کن ثابت ہوا۔ اور وہ امتحان میں کبھی نہ بیٹھ سکے۔

ٹھیک ایک دن پہلے ہم نے خوب پلوفائٹ کی اسی دوران اُنھوں نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔

"ایک مقام آسمان ہے" انھوں نے وضاحت کی "وہاں ایک جگہ ہے پالتو جانوروں کی دوکان کی طرح! زیادہ بڑی سی اُس میں لاکھوں پنجرے ہوتے ہیں جس میں پالتو جانوروں کی بجائے صرف بچے ہوتے ہیں۔ جو صبر سے بیٹھے رہتے ہیں تا آنکہ دنیا میں اُن کی واپسی کی باری نہ آجائے! میں بھی ایک ایسے ہی پنجرہ میں بند تھا۔ ایک دن میں بہت زور سے ہنسنے لگا ساتھ ساتھ زور زور سے چیخنے بھی لگا۔ میں نے اپنے پڑوس کے پنجروں میں بند بچوں کو نوچنا کھسوٹنا اور مکے مارنا شروع کر دیا۔ وہ سب مل کر چیخنے لگے۔ فرشتے بیچارگی کے عالم میں دیکھتے رہے۔ انھوں نے بہت دفعہ تنبیہ کی کہ وہ مجھے قبل از وقت دنیا میں بھیج دیں گے۔ فطری طور پر میں نے اُن کی تنبیہوں پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنی مرضی سے چیرٹ پھاڑ کا سلسلہ جاری رکھا فرشتوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ انھوں نے مجھے پنجرے سے نکال کر باہر اس دنیا میں پھینک دیا۔" اُنھوں نے اپنے کندھے اچکاتے ہوئے اپنی کہانی مکمل کر دی تھی۔

اگر آسمان پر اُن پنجروں سمیت صرف ایک مقام ہوتا اگر میرے دادا جان وہاں دوبارہ ناشائستہ حرکتیں کرنا شروع کر سکتے اور پھر انھیں دوبارہ دنیا میں واپس بھیج دیا جاتا تو میں اُن سے اتنی گرمجوشی سے بغل گیر ہوتی کہ وہ دوبارہ پھر یہ جگہ چھوڑنے کا نام نہ لیتے اور پھر ہم ہوتے اور ہماری "پلوفائٹ"۔

قومی زبان (۱۱) نومبر ۱۹۹۵ء

جملہ حقوق محفوظ

# جُستجو

از

جناب ممتاز حسن صاحب احسن
سیکنڈ ایر۔ ایف سی کالج لاہور

۱۹۲۵
باہتمام شیخ غلام حسین صاحب واقف پبلشر
مطبوعہ لاہور پرنٹنگ پریس لاہور۔
جلد اوّل قیمت ۴ آنے

قومی زبان (۱۲) نومبر ۱۹۹۵ء

# نذر

میں اس ناچیز نظم کو اپنے محترم
دوست جناب نیاز محمد خاں صاحب
"نذر" کے نامِ نامی سے منسوب کرتا ہوں۔
گر قبول اُفتد زہے عزو شرف

نیازمند

احسن

# تمہید

میں اس مختصر مگر پُر مغز اور پرجوش نظم کو جو میرے عزیز دوست ممتاز حسن صاحب نے اپنے قلب کی حقیقت کے بنانے کے لیے اپنے اعلیٰ دماغ کی وساطت سے تحریر فرمائی ہے بڑی وقعت اور تحسین سے دیکھتا ہوں۔ عزیز ممتاز حسن ایک سولہ یا سترہ سالہ نوجوان کے دلوں کی مضطرب حالت سے پوری پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کا اپنا دل تمام طبقۂ نوجواناں کے دلوں کا ترجمانِ حقیقی ہے۔ اور اُن تمام جذبات کا مسکن ہے جو ہمارے نوجوانوں کے لیے باعث بیم ورجا ہیں۔ ہم آئندہ ممتاز حسن صاحب سے بڑی بڑی توقعات رکھتے ہیں۔ اُمید ہے کہ ان کے خیالات کی اس سے بھی بڑھ چڑھ کر نشوو نما ہوگی۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو اضطراب یا ہیجان یا شکوک انسان کے دل میں پیدا ہوکر اسے جستجوئے مبدء الفیض خالقِ ارض و سما کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اور جن کو انسان اپنی کم بضاعتی کے باعث اپنے راستے میں حائل سمجھتا ہے۔ وہی اصل میں اس کے حقیقی رہنما اور رفیق ہوتے ہیں۔ جو اس میں جدت اور قوت اور اعتماد پیدا کرتے ہیں اور آخر میں جب زندگی کا آخری ایکٹ (ACT) ختم ہونے پر آتا ہے۔ تو اسے منزلِ مقصود پر پہنچا دیتے ہیں۔ مجھے اس موقعہ پر ایک مشہور جرمن فلسفی کا قول یاد آگیا ہے۔ کہ "اگر مجھ سے کہا جائے کہ حصول علم اور تلاشِ علم میں سے ایک چیز کو اپنے لیے پسند کرو تو میں تلاشِ علم کو حصولِ علم پر ہزار درجہ ترجیح دوں گا اور اسی کو اپنا نصب العین قرار دوں گا" میں سمجھتا ہوں کہ خداوند کریم کا یہ کوئی کم عطیہ نہیں ہے کہ انسان کے دل میں ایک تلاطم اور طوفان برپا ہو اور اسے اگر منزلِ مقصود نہ بھی نظر آئے تو بانگِ جرس تو سنائی دیتی رہے۔ حضرتِ عطارؒ نے کیا خوب کہا ہے:

کفر کافر را و دیں دیندار را
ذرّہ دردِ دلے عطارؒ را

ہمارے نوجوان شاعر نے بھی اسی مضمون کو خوب ادا کیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ باوجود اس نظم کے میری نگاہ میں کسی حد تک PESSIMISTIC ہونے کے ناتے بھی اس میں جو روح جھلکیں مار رہی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ اس میں جوشِ عمل پایا جاتا ہے۔ اگرچہ عمل کے لیے اس میں کوئی پروگرام نظر نہیں آتا۔

میرے عزیز ممتاز حسن صاحب کو شاعری سے ایک خاص مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ زبانِ اردو فارسی پر خوب حاوی ہیں۔ اور زیادہ حاوی ہوسکتے ہیں۔ اگر وہ صوفیانہ اور فلسفیانہ خیالات میں کسی حد تک تخفیف کر کے مناظرِ قدرت و مسائلِ زندگی کی طرف توجہ دیں تو وہ اپنے وقت میں ایک ادب کی اور قوم کی سچے معنوں میں خدمت کریں گے۔

پروفیسر محمد شفیع بھٹی۔ ایم۔ اے
مشن کالج۔ لاہور

قومی زبان (۱۴) نومبر ۱۹۹۵ء

# جستجو

دیکھتا ہوں، مگر نہیں دیکھتا، سُنتا ہوں، مگر نہیں سنتا، جانتا ہوں مگر نہیں جانتا۔ تیرا نشان ہر جگہ ملا، دل گواہی دیتا ہے، کہ تو ہر جگہ موجود ہے مگر آہ! مجھے یقین نہیں آتا،.....

ترا جلوہ سو بسو ہے۔ مرا نالہ کو بکو ہے، دل نے کہا، کہ مجھ میں اور تجھ میں کوئی فرق نہیں، مگر میں کون ہوں! کیا ہوں؟ کہاں ہوں؟ میری آرزو ایک نغمہ ہے اور میری جستجو ایک مسئلہ لاینحل۔

دہر کی خوش کامیوں میں کس کو کیا ملتا نہیں
اِک مِرا دل ہے کہ اُس کا مدعا ملتا نہیں

زائرانِ زندگانی کی شبِ تاریک میں
دور ہے منزل مِری اور راستہ ملتا نہیں

نقدِ جاں کی خیر مانگو مرحلِ آفاق میں
راہزن ملتے ہیں لیکن رہنما ملتا نہیں

خوئے اُلفت ہے جہاں کے رہنے والوں میں کہاں؟
بیوفا ملتے ہیں لاکھوں، باوفا ملتا نہیں

ہاتھ میں لے کر چراغِ داغِ دل ڈھونڈا جہاں
جس کے دل میں درد ہو، وہ آشنا ملتا نہیں

ناامیدی میں یہ ہے پیغامِ عقلِ نارسا
کس کو ڈھونڈوں؟ مجھ کو تیرا بھی پتا ملتا نہیں

کچھ تو ہے آخر مگر کیا جانے کیا ہے زندگی
کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کہاں ہوں؟ کچھ پتہ ملتا نہیں

ایک کہتی ہے تجھے دنیا "انیسِ بیکساں"
آسرا کوئی مجھے تیرے سوا ملتا نہیں

گلشن و صحرا میں ڈھونڈا، کوہ و دریا میں تجھے
وائے ناکامی! کہیں تیرا پتا ملتا نہیں

زرگسِ مستانۂ یا سروِ رعنا؟ کیستی
در صدف دُردانۂ یا موجِ دریا؟ کیستی

کیا وہ دن تھے جب جنوں کی کار فرمائی نہ تھی
تھی نہ یہ صحرا نوردی آبلہ پائی نہ تھی

میں تو تھا، لیکن مجھے احساس ہونے کا نہ تھا
رنج و غم سے، یاس و حرماں سے شناسائی نہ تھی

دور تھا وہم و گماں سے یہ جہانِ آب و گِل
اپنے مسکن سے طبیعت میری گھبرائی نہ تھی

گلشنِ ہستی نہ تھا طرزِ تغیر آشنا
قیدِ موسم میں ابھی فصلِ بہار آئی نہ تھی

جادۂ وحدت میں تھا مستور کثرت کا وجود
پردۂ کثرت میں وحدت اب تلک آئی نہ تھی

جلوہ آرا بے حجابی میں تھا محبوبِ ازل
تھا مرا مسکن دیارِ لامکان و لازمان
ہمنشینوں میں مجھے ملتا تھا تسکیں کا مزا
بادہ نوشِ بیخودی تھی مے پرستانِ ازل

در بدر یوں عشق کی دنیا میں رسوائی نہ تھی
زندگی میری جمالِ یار کا آئینہ تھی
قیدِ تنہائی و خوئے ناشکیبائی نہ تھی
شبنمِ غم سے نہ تھا مانوس بستانِ ازل

○

قلزمِ ہستی میں پیدا یک بیک طوفاں ہوا
مشت بھر تنکوں میں پیدا ہو گئیں پابندیاں
نذرِ گلچیں ہو گئیں ساری مری رنگینیاں
اِک جہانِ رنج و غم پوشیدہ حرفِ کن میں تھا
طاقتِ دید اُٹھ گئی دیوانگی باقی رہی
خوگرِ حسرت مرا معمورۂ شادی نہ تھا
آتشِ فرقت بجان و شعلۂ حرماں بہ دل
زندگی بارِ گران و کینہ ور چرخِ کبود

زیرِ سطحِ آبِ پنہاں گوہرِ تاباں ہوا
آشیاں میرا ہی میری قید کا ساماں ہوا
شبنمِ گریاں سے گُل ہر باغ میں خنداں ہوا
آنکھ جھپکی تھی کہ وہ نظارہ بھی پنہاں ہوا
چھوڑ کر آزادیاں زنجیریٔ ارماں ہوا
کیا بلا آئی کہ میرا گھر کا گھر ویراں ہوا
یوں پرِ پرواز سے محروم مرغِ جاں ہوا
آہ ! لطفِ آدمیت در فراقِ تو نہ بود

---

تلخ ہے قیدِ عناصر فطرتِ آزاد کو
بلبلِ نالاں تڑپتا ہے قفس میں رات دن
کر دیا بے بال و پر اور اُسپہ "جاں بخشی" بھی کی
گوہرِ مقصود سیلِ تُند رَو میں کیا ملے
روئے زیبا سے تعلق سوزشِ دل کو نہیں
تا ابد بامِ محبت سے وہ ناواقف رہا
آہ ! خاموشی بھی حاصل باغِ ہستی میں نہیں
چشمِ گریاں، سینہ بریاں لیکے آج آیا ہوں میں
داغ ہیں سینے میں مثلِ آفتاب و ماہتاب

پھر ستاتی ہے وطن کی یاد مجھ ناشاد کو
دو خبر جاکر مرے نامہرباں صیاد کو
ہائے کیا طرزِ ستم سُوجھی ستم ایجاد کو
عمر بھر دیکھا کیے آنکھوں کے اشک آباد کو
جانِ شیریں رائگاں کھونی نہ تھی فرہاد کو
جس نے ٹھیرایا ہے زینہ حسنِ بے بنیاد کو
چھیڑتا ہے ہر کوئی مجھ خانماں برباد کو
اے غیاثِ مستغیثاں ! سُن مری فریاد کو
میں سراپا سوزِ غم ہوں دل سراپا اضطراب

مشتِ خاکستر ہوں لیکن مخزنِ حکمت ہوں میں
بےنظیر و بےمثل ہوں زیبِ ہر مدحت ہوں میں

آب و خاک و بادو آتش زیرِ فرماں ہیں مرے
حکمرانِ بحر و بر ہوں، معجزِ فطرت ہوں میں

جوہرِ فضل و ہنر ہوں، گوہرِ فہم و ذکا
شب چراغِ عقل و دانش شمۂ ظلمت ہوں میں

سامنے میرے زمین و آسماں ہوتے ہیں خم
کشورِ امکاں پہ جو غالب ہو وہ طاقت ہوں میں

پر نہیں دیکھا کبھی اِسے صاحبِ قدرت! تجھے
گو کہ تیرا ہی نشاں ہوں، مظہرِ قدرت ہوں میں

بدنصیبی کا مِری کوئی ٹھکانا ہی نہیں
حسرت و غم ہوں سراپا شُومیٔ قسمت ہوں میں

راز کیا ہے؟ کیوں نہیں آخر مؤثر جذبِ دل
ماہِ نور افشاں ہے تو اور قلزمِ اُلفت ہوں میں

ہاں بجھادے ایک جھونکے میں مجھے بادِ صبا
بیکسی میں صورتِ شمعِ سرِ تُربت ہوں میں

مجھ سے چھپنا چھوڑ دے میں موسیٰؑ عمراں نہیں
جو جہاں کو پھونک دے وہ آتشِ فرقت ہوں میں

لَن ترانی مت سُنا اس طالبِ مہجور کو
راکھ کر دیتی ہے جس کی آہ کوہِ طور کو

اے فروغِ دو جہاں، اے جلوۂ تو سُو بسُو
مشتِ خاکِ من بہ شوقِ تو پریشاں کو بکو

روئے رخشانت عیاں ازپردۂ اوہامِ من
من گرفتارِ طلسمِ امتیازِ ما و تُو

زندگانی آرزو و آرزو لا انتہا
زندہ ماندن ہجر تو اے انتہائے آرزو

اے تمنّا! محورِ مقصودِ تمنّا کم نہٗ
او ضمیرِ جستجوئیم، من غریقِ جستجو

باصفا دارم دِلے در سینہ چوں آئینہٗ
ایں قدر خواہم کہ بینم عکسِ رویت روبرو

پائے امیدے بہرجا میزنم آید بہ سنگ
ہر خیالے در دلِ من مدفنِ صد آرزو

قلبِ مضطر تشنۂ "تسکیں" و محرومِ "یقیں"
جانبِ من یک نگاہِ لطف اے بیگانہ خُو

تازگی جو ید بہ دامانِ تو جانِ سوختہ
من گلِ پژمردہ، تو سرچشمۂ ہر رنگ و بو

اے قرارِ بے قراراں، اے دوائے دردِ دل
رائگاں اندر علاجم نسخۂ لاَ تقنطو

آستانِ یار را پنہاں ز نظرم می کبت
صد تفو بر ہستی دنیا و مافیہا تفو

یا بزندانم درا یا خود مرا آزاد کن
گوشِ شنوا! بیش ازیں دانم نہ حرفِ گفتگو

آفتِ جانم شوی اے دردِ فرقت برقدر
ازمن ایں ہرگزنیایہ دست بردارم ازو

من گنہ گارِ تمنّا، تو سزاوارِ عطا
تو کفیلِ آرزو، من تشنہ کامِ آرزو

من زہر سو نحنُ اقربُ می شنیدم روز و شب
می دہد ہر ذرہ خاکی صدا سُبحانہٗ

ہر کجا بینم ترا موجود ولا موجود ہم
در حجاب و بے حجابی کشتۂ صد حیرتم

اے حسنِ شوریدہ سر، قسمت کا یوں ماتم نہ کر
سامنے ناکامیوں کے سر کو اپنے خم نہ کر

آہ و زاری ناروا ہے عشق کی سرکار میں
جل! مگر خاموش جلِ نالوں سے پُر عالم نہ کر

کچھ خبر بھی ہے تجھے یاں کون ہے خنجر بکف
زخم کو اے بے خرد شرمندۂ مرہم نہ کر

ابرِ باراں بن کے ہر ہر ذرّے کو سیراب کر
گلستاں میں پیرویِ قطرۂ شبنم نہ کر

آہ پیدا اتصالِ اشک و داغِ دل سے کر
سرو کامی سے اس آتشخانہ کو مدھم نہ کر

کوشش و تدبیر سے حاصل ہے لطفِ زندگی
اپنی بے تابی کو وقفِ گریہ پیہم نہ کر

باغبانِ چارہ فرما بن ترا گلشن ہے دل
لیکے دل، دل میں اُتر جا وادیٔ ایمن ہے دل

وادیٔ کہسار میں حیران نہ یوں بیکار ہو
اے بخاک افتادہ عازم جانبِ کہسار ہو

سر میں پہلے پیدا کر داغِ آرزو
اور پھر سودائیِ دیدار روئے یار ہو

ہوشیاری میں چھپادے انتہائے بیخودی
بیخودی کیا؟ بیخودی میں گر نہ تو ہوشیار ہو

گریہ ساماں آتشِ الفت سے مثلِ موم ہو
مثلِ دریا پر نہ کشتی کے پئے آزار ہو

اس کو سینے میں امانت رکھ بڑی دولت ہے یہ
دیکھ دردِ دل نہ صرفِ دیدۂ خونبار ہو

ہے اسی سے بہتر ظلمت خانۂ دل کی ضیا
شعلۂ الفت رہینِ آہِ آتشبار ہو

جا کے اے ناداں صدف سے سیکھ رازِ خامشی
لب ترے ساکت رہیں اور سینہ گوہر بار ہو

اس کی خاموشی نہیں محویتِ نظارہ ہے
نکتہ بیں تو بھی مثالِ نرگسِ بیدار ہو

زندگی کی معرفت میں ہے نشانِ نفس و رب
تو اسی نکتے سے غافل واقفِ اسرار ہو

زندگی پر کر نظر، گر خواہشِ دیدار ہے
زندگی کیا ہے؟ کسی کا روئے پُر انوار ہے

کوہِ سنگیں ہے محیطِ بادپا ہے زندگی
ذرّے ذرّے میں جہاں کے رونما ہے زندگی

بحرِ ناپیدا کنار اور ناخدا ہے زندگی
عقدۂ مشکل ہے اور عقدہ کشا ہے زندگی

ابتدا لا ابتدا و انتہا لا انتہا
زندگی کی ابتدا و انتہا ہے زندگی

موت کہتے ہیں جسے زندہ اسی کے دم سے ہے
دیکھ اے ناداں! فنا کیسی 'فنا' ہے زندگی

کیوں ہراساں ہے اجل کے خوف سے اے مشتِ خاک!
گنجِ مرقد میں بھی تیرا آسرا ہے زندگی

عندلیب و گل کہیں اور سبزہ و شبنم کہیں
اپنی یکرنگی میں بھی رنگیں ادا ہے زندگی

زندگی انساں کی ہے اِک موجِ بحرِ بیکراں
سُو بسُو فرمانروا ہے بادشا ہے زندگی

سینکڑوں پابندیوں سے ہے نظامِ زندگی
سینکڑوں زندانیوں کا ہے زندگی

ہر قدم پر ہے صدا "اے راہرو! ہشیار ہو"
کاروانِ دہر میں بانگِ درا ہے زندگی

قعرِ گمنامی ہے یا ہے عرشِ شہرت آوری
اے مسافر! ہر طرف کو رہنما ہے زندگی

آج ہے گر شادکامی تو ہیں کل ناکامیاں
بھولنا اس پر نہ ہرگز بیوفا ہے زندگی

زندگی کا لطف کیسا؟ دل اگر ٹکڑے نہ ہو
اشکِ خونیں، نالہ، آہِ نارسا ہے زندگی

"جستجو" میں ڈھونڈ لے دنیا میں جینے کا مزا
سعیِ پیہم ہے تلاشِ مدعا ہے زندگی

زندگی تیری ہے اے غافل پیامِ جستجو
ہے دوامِ زندگی لطفِ دوام جستجو

احسن

## میری آرزو

مری آرزو کو بھی اے خدا، ترے فیضِ عام میں بار ہو
مرے دل کو گونہ سکون ہو، مری بیکلی کو قرار ہو

یہ طلسمِ ہستی بے بقا میں چمن میں طائرِ بے نوا
نہ کوئی یگانہ نہ آشنا تُو ہی اپنا ہمدم و یار ہو

مجھے اپنے عشق کا سوز دے مجھے بیخودی شب و روز دے
مرے دل میں ہو تری آرزو، یہی زندگی کا شعار ہو

مجھے تُجھ سے خوئے نیاز ہو، تیرا جلوہ جلوۂ نیاز ہو
یہی بندگی ہو، نماز ہو، یہی شیوۂ دلِ زار ہو

یہ حجاب آنکھوں سے دُور ہو، یہ جہاں تجلیٔ طور ہو
مرے جان و دل کو جو پھونک دے، مرے سینے میں وہ شرار ہو

مجھے دے نہ راحتِ بے بقا، مرے دل کو غم سے نہ کر جدا
یہی دل جو عشق میں جل گیا مری حسرتوں کا مزار ہو

تری جستجو میں پھرا کرے، تری آرزو میں جلا کرے
جسے یاد بھی نہ فنا کرے، وُہی میری مشتِ غبار ہو

ہوئے باوفا، سبھی بیوفا، ترے بن نہیں کوئی آسرا
ہے اکیلا احسن بے نوا، تُو ہی حامیٔ کار ہو

کوائف:۔

اصل نام: محمود الحسن

تخلص: اختر لکھنوی

والد کا نام: حافظ محمد حسین

سالِ پیدائش: ۱۹۳۵ء

مقامِ پیدائش: محلہ زہریٰ۔ لکھنؤ

ابتدائی تعلیم: دینی تعلیم والد بزرگوار سے حاصل کی پھر دنیاوی تعلیم پائی

ملازمت: پہلی ہجرت ڈھاکا ۱۹۵۰ء اور انجمن ترقی اردو کے آفس سکریٹری رہے
پھر ۱۹۶۲ء میں ریڈیو پاکستان ڈھاکا سے منسلک ہوئے اور دوسری ہجرت کراچی ۱۹۷۴ء سے لیکر ریٹائرڈ ہونے تک

انتقال: ۲۷ ستمبر ۱۹۹۵ء بروز بدھ شام سوا پانچ بجے دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

تصانیف:۔

۱۔ شعری مجموعہ دیدۂ تر ۱۹۸۶ء
۲۔ نعتوں کا مجموعہ حضور ﷺ ۱۹۸۸ء
۳۔ نعتوں کا مجموعہ سرکار ﷺ ۱۹۹۵ء
۴۔ غزلوں کا دوسرا مجموعہ زیر ترتیب ہے

## ملک کے معروف شاعر اختر لکھنوی کی رحلت پر کہا گیا

## قطعۂ تاریخ

از

**مختار اجمیری**

**آہ! رابطۂ محبت اختر لکھنوی**

۱۹۹۵ء

**جناں مکاں اختر**

۱۴۱۶ھ

سُن کے خبر یہ آج میں سکتہ میں آگیا — خوش خو وہ خوش مزاج، وہ اختر چلا گیا
جو رہ گئے ہیں لوگ وہ ماتم کیا کریں — جو چل بسا وہ منزلِ مقصود پا گیا
شاعر تھا ذی شعور، سخن فہم، فن شناس — فکر و نظر کی بزم میں آیا تو چھا گیا
تھا شغل اُس کا دوشِ صبا پر پیام کا — اُڑ کے قضا کیساتھ وہ جنت چلا گیا
مختار اُس کو "حاضرِ دربار" کہہ چکے — "اختر نسیم خلد" بھی کیا خوب تھا، گیا

۱۴۱۶ھ — ۱۹۹۵ء

قومی زبان (۳۰) نومبر ۱۹۹۵ء

# غزل

اختر لکھنوی

صبح جیسی، شام جیسی، رات جیسی صورتیں
ذہن کو گھیرے ہوئے ہیں، جانے کتنی صورتیں

ہو چکے ہیں مسخ، چہروں کے خدوخال اسقدر
اجنبی لگتی ہیں، اپنے دلبروں کی صورتیں

سرزمینِ آب پر رکھے گئے بے آب ہم
ہم نے دیکھی ہیں، مہینوں کربلا کی صورتیں

وہ در و دیوار وہ بھینٹے لہو کے جا بہ جا
تھیں خزاں کے دور میں بھی، عہدِ گل کی صورتیں

تم بھی سن سکتے نہیں، ہم بھی سنا سکتے نہیں
کیسے گھسائی گئی تھیں، چاند جیسی صورتیں

کچھ تھیں زنداں کے لئے، کچھ قتل گاہوں کیلئے
سر کی جنبش میں نہاں تھیں، کیسی کیسی صورتیں

ان کے ہونٹوں پر ہنسی کی جستجو کرتے ہیں لوگ
عمر جن کو ہوگئی، دیکھے خوشی کی صورتیں

پوچھنے والے، مری وحشت زدہ آنکھوں سے پوچھ
موت کے دیکھے ہیں کتنے روپ کتنی صورتیں

تاثراتی مضمون

# اختر لکھنوی ..... شخصیت اور شاعری

احمد زین الدّین

اختر لکھنوی ۲۷ ستمبر ۱۹۹۵ء کو شام سوا پانچ بجے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور اپنے بہت سے ماتم گساروں کو تنہا چھوڑ گئے۔ اُن کے اس طرح دنیا سے چُپ چاپ چلے جانے کا یقین نہیں آتا۔ انھیں مرحوم کہنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں یہ بجا کہ موت ایک حقیقت ہے مگر ایسے پیاروں کے اٹھ جانے کی جو کیفیت ہوتی ہے اُس کا بیان ممکن نہیں۔ لگتا ہے وہ ابھی کہیں سے آجائیں گے اور مسکرا کر خیریت دریافت کریں گے مصافحہ کریں گے اور سراپا خلوص بن کر محبت بھری نظروں سے یوں دیکھتے رہیں گے گویا اپنے بہت قریبی عزیز سے مل رہے ہوں ہم سب اُن کے عزیز ہی تو تھے انھوں نے اپنے رویے، تخاطب، ملنے کے انداز اور طبیعت کے ٹھہراؤ سے کبھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ ہم اُن کے اپنے نہیں ہیں۔ مہینوں بلکہ برسوں گزر جانے کے بعد بھی جب ملتے تو اُسی خلوص اور انداز سے ملتے نہ کبھی گلہ کرتے، نہ برہم ہوتے بس مسکرا کر دیکھتے رہتے۔ اُن کی مسکراہٹ میں وہ کیفیت ہوتی کہ شرمساری کے احساس سے پورا وجود لرز جاتا اور پشیمانی کے ٹھنڈے پسینے پیشانی پر عیاں ہو جاتے۔ ایسے عالم میں خفت مٹانے اور اپنی کوتاہی پر نادم ہونے کے خیال سے میں انھیں گلے لگا لیتا اور اختر بھائی ہنسنے لگتے۔ کہتے تھیں خط لکھا۔ ریڈیو پروگرام کی اطلاع دی فون کیا۔ مگر.....؟ آخر کہاں غائب تھے۔ بتا تو دیا ہوتا.....! میں بہانے بناتا... تو وہ ہنستے رہتے۔ "اچھا اچھا میں سمجھ گیا.....! اب اختر بھائی کہاں ملیں گے۔ میرے آنسو، جو پلکوں پر بہت کم آتے ہیں کہ آج انھیں پوری شدّت سے یاد کر رہے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے اور یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ سب سے پہلے بحیثیت نیوز ریڈر ریڈیو پاکستان ڈھاکا سے مجھے انھوں نے متعارف کروایا۔ پھر صحافت کی دنیا میں ہم ساتھ رہے۔ ہفت روزہ "چترالی" میں ایک ساتھ کام کیا۔ میری شادی کے موقع پر قرآن مجید کا سب سے بڑا تحفہ پیش کیا اور "چترالی" میں روداد شائع کی۔ یہ اُن کی محبت کی وہ چھوٹی چھوٹی سی عنایتیں تھیں جو میرے دل پر نقش ہیں اور احسان مندی کا ایک ایسا جذبہ میرے دل میں موجزن ہے جس سے انسانیت اور بھائی چارے کا اعتبار قائم ہے۔ ایسے لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں۔ اختر بھائی کی وضع قطع بھی جداگانہ تھی۔ وہ گیروا رنگ کا کرتہ اور اُسی رنگ کا قدرے بڑے پائنچے کا پاجامہ پہنتے جو علیگڑھ پاجامے سے مختلف ہوتا اور لکھنوی وضع کی یاد دلاتا۔ آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ بھوری آنکھیں ہر وقت کسی خیال میں گم رہتیں۔ پان کھاتے، سگریٹ بھی کبھی کبھار پی لیتے۔ پان کے سارے لوازم ساتھ رکھتے۔ کم

بولتے مگر سب کا درد لیے پھرتے۔ انھوں نے جانے کتنے لوگوں کے ساتھ کیا کیا اس کا احوال تو کم ہی لوگ جانتے ہوں گے۔ کہ وہ نمود و نمائش اور احسان جتانے کے قائل نہ تھے۔ بس مخلوقِ خدا کے کام کیا کرتے۔ بے غرض، بے لوث اور بے صِلا ہو کر۔ منفعت کی اُنھوں نے کبھی پروا نہ کی۔

ابھی چند روز قبل اُن کے انتقال کی خبر ملنے کے بعد میں چند اہلِ قلم حضرات سے ٹیلفون پر اُن کے بارے میں تاثرات لے رہا تھا۔ سب نے ان کی شریف النفسی، محبّت خلوص اور انسان دوستی کی باتیں کیں اور گلو گیر لہجے میں اپنے تاثرات بیان کیے۔ جب میں نے ساحر لکھنوی صاحب کو جو لکھنؤ کے اُن کے ہم محلہ ہیں فون کیا تو انھوں نے شرافت اور خلوص کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اختر جتنے اچھے اہلِ قلم اور جتنے خوبصورت شاعر تھے اُس سے بھی زیادہ اچھے انسان تھے مجھ سے پہلی ملاقات کے بعد ہی سے انھوں نے جس فیاضی سے اپنے خلوص اور محبت کی دولت سے مالامال کر دیا اور انتہا درجے کی بے غرضی کے ساتھ مجھ سے سگے بھائیوں کے سے مراسم رکھے اُن کو اس حالت میں بھی نبھاتے رہے جب یہ محسوس ہوتا تھا کہ اُن کی جو سانس آگئی ہے سو آگئی اب شاید اس کے بعد نہ آسکے۔ میری دو کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں اس حالت میں بھی جو جدوجہد کی یہ انسانی قدروں کی وہ معراج ہے جس سے آج ہمارا پورا معاشرہ محروم ہو چکا ہے۔ خود غرضی، حسد اور نفرت کے جس سیلاب میں پھنس کر اس قوم کا سفینہ ہچکولے لے رہا ہے اس سے اختر لکھنوی جیسے مخلص بے غرض اور محبت کرنے والے انسان کے اعلیٰ انسانی اقدار کا بادبان ہی اس کشتی کو گرداب سے نکال کر کنارے لگا سکتا ہے۔"

ساحر لکھنوی صاحب بے تکان یہ سب کچھ کہے جا رہے تھے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ اُن کے لہجے میں اختر بھائی کے لیے تشکر اور ممنونیت کے جو جذبات اُمڈے چلے آرہے ہیں انھوں نے اُن کی آواز کو گلو گیر کر دیا ہے اگر میں اُن کے رُو بُرو ہوتا تو شاید ان آنسوؤں کو بھی دیکھ لیتا جو اُن کی آنکھوں کو نم کر چکے تھے اُن کا دل رُو رہا تھا اُس بھائی کے لیے جو کہا کرتا میں اُن کے (ساحر صاحب) آنگن میں کھیلا کرتا تھا۔ گویا یہ کہہ کر اختر بھائی اُس حق کو ادا کرنا چاہتے تھے جس کو انھوں نے مرتے دم تک ادا کیا اور بیماری اور کمزوری کی انتہائی حالت میں بھی ساحر صاحب کی دو کُتب کو مکمل کر دیا۔ ایسے محلہ داری نبھانے والے لوگ اب کہاں .....؟ اگلی شرافت کے ایسے نمونے اس دورِ ناپرساں میں اب نہیں ملیں گے۔

اختر بھائی کا اصل نام محمود الحسن اور قلمی نام اختر لکھنوی تھا۔ اُن کے والد کا نام حافظ محمد حسین تھا وہ ۱۹۳۵ء میں لکھنؤ کے مردم خیز محلہ نرہی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی مذہبی تعلیم والد سے حاصل کی اور قرآن مجید حفظ کیا اور پھر دنیاوی تعلیم حاصل کی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد وہ تلاشِ معاش میں سرگرداں ہو گئے۔ وہ بڑی خوش الحانی سے قرآن پاک کی تلاوت کرتے اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی خوبصورت اور پاٹ دار آواز عطا کی تھی۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں وہ پہلی ہجرت کر کے ڈھاکا پہنچے اور ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۵ء تک انجمن ترقی اردو ڈھاکا سے بحیثیت آفس سکرٹری منسلک رہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انجمن ترقی اردو کا دفتر ڈھاکے میں نواب پور روڈ پر ایک بوسیدہ سی عمارت میں واقع تھا۔ اس عمارت کی خستہ حالی دیدنی تھی اور اس سے بھی زیادہ مخدوش اُس کی لکڑی کی بنی ہوئی سڑھیاں تھیں اس دو منزلہ عمارت میں نیچے کی جانب دو کانیں تھیں اور اوپر انجمن کا کتب خانہ، ریڈنگ روم اور آفس تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے اور اترتے بڑی احتیاط کرنی پڑتی مبادا لڑھک کر مین روڈ پر نہ آجائیں۔ مغربی پاکستان سے گئے ہوئے شاعروں ادیبوں کو ہاتھ پکڑ کر اوپر لے جایا جاتا اور کمال احتیاط اور ہوشیاری سے اُتارا جاتا اختر بھائی نے بڑی محنت اور لگن سے انجمن کا انتظام و انصرام چلایا۔ پھر اس کے بعد سرور بارہ بنکوی مرحوم اس کے آفس سکریٹری مقرر ہوئے اور انھوں نے ماہنامہ "آب و گل" نکالا۔

۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۱ء تک اختر بھائی صحافت کے میدان میں سرگرم عمل رہے۔ وہ روزنامہ "انقلاب" ڈھاکا۔ روزنامہ "امن" ڈھاکا اور ماہنامہ "فنکار" ڈھاکہ کے مدیر رہے اس کے علاوہ دیگر شام کے اخبارات و جرائد میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ ریڈیو پاکستان ڈھاکا سے منسلک ہو گئے اور سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد وہ ۱۹۷۴ء میں دوسری ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ پہلی تعنیاتی راولپنڈی ریڈیو پاکستان میں ہوئی اور پھر ۸۵ - ۱۹۸۴ء میں کراچی آ گئے اور آخر دم تک یہیں رہے۔ پھر ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ ریڈیو پاکستان کے ہر کام سے وہ واقف تھے۔ سقوطِ ڈھاکا سے پہلے ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب وہ تنہا نشریات کا کام سر انجام دیتے رہے تھے۔ سچے پاکستانی اور محب وطن کی حیثیت سے انھوں نے اس راہ کی تمام صعوبتیں برداشت کیں۔ ہفتوں گھر والوں سے دور رہے۔ اُس دور پرآشوب میں صرف اُن کی آواز گھر والوں کو اُن کے زندہ رہنے کا ثبوت دیتی۔ ریڈیو پاکستان ڈھاکا کی عمارت اُس کے در و دیوار اُن کی وفا شعاریوں کے گواہ ہیں۔

اُن کی ذہانت اور خداداد حافظہ کا یہ عالم تھا کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد مقامی آبادی کے درندہ صفت اور جنونی وحشیوں نے اردو بولنے والوں پر ظلم کے جو پہاڑ توڑے اور جیسے جیسے انسانیت سوز مظالم ڈھائے اُس کو انھوں نے پاکستان آنے کے بعد اپنے پہلے مجموعہ کلام "دیدۂ تر" میں یکجا کر دیا۔ اس شعری مجموعہ میں "مرثیہ نما" غزلیں ہیں جو مشرقی پاکستان مرحوم کے اُس المیے سے متاثر ہو کر کہی گئی ہیں جن میں نہ جانے کتنے مرحومین وفا کی تاریک راہوں میں مارے گئے اور بے گور و کفن دنیا سے اُٹھ گئے۔ انھوں نے "شہدائے وفا" کو اشعار کی زبان میں جس موثر انداز سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اُس کی نظیر اردو شاعری میں مشکل سے ملے گی۔ میرے نزدیک واقعہ کربلا کے بعد انسانی تاریخ کا یہ دوسرا بڑا سانحہ ہے جس کی شدت انسانی ذہن کو تادیر مضطرب کرتی رہے گی۔

اس مجموعہ کلام کی دوسری بڑی اور حیرت انگیز خوبی یہ ہے کہ اس میں تمام غزلیں اُسی ترتیب سے شامل کی گئی ہیں جس طرح یکے بعد دیگرے واقعات رونما ہوئے۔ اگر پہلی غزل سے آخری غزل تک تمام واقعات کو یکجا کیا جائے تو سانحۂ مشرقی پاکستان کی تاریخ مرتب ہو جائے گی۔ گویا یہ مجموعہ ایسا روزنامچہ ہے جس میں ہر روز کے واقعات درج کر دیے گئے ہیں۔ یہاں اُن کے زود اثر حافظے اور ذہن رسا کی غیر معمولی صلاحیت کی داد دینی پڑتی ہے۔ یہ انھیں کا کمال ہے کہ انھوں نے سارے واقعات و حالات کو ذہن میں محفوظ رکھا اور پھر دل کی گہرائیوں سے محسوس کر کے انھیں اشعار کے قالب میں ڈھال دیا۔

اُن کے یہاں زبان کی سادگی، جذبے کی سچائی، واقعات کی دل آویزی اور لہجے کی اثر انگیزی اس طرح ملتی ہے کہ اُسے پڑھ کر انسان ایک لمحے کو سکتہ میں آجاتا ہے۔ دراصل انھوں نے المیہ مشرقی پاکستان کی لفظی تصویر کشی اس خوبصورتی اور چابکدستی سے کی ہے کہ سارے واقعات آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ کچھ اشعار دیکھیے:

کل کس کو یقیں آئے گا نسلوں کے سفینے
وہ ناؤ ڈبودے گی جو کاغذ سے بنی تھی
ساغر لیے کچھ لوگ کھڑے تھے لب ساحل
اک عہد کی تقدیر تھی اور ڈوب رہی تھی

جوئے خوں آنکھوں سے یوں پہلے کبھی جاری نہ تھی
زندگی کے نام پر گھر گھر عزاداری نہ تھی
سرزمینِ آب پر، رکھے گئے بے آب ہم
ہم نے دیکھی ہیں، مہینوں کربلا کی صورتیں

پوچھنے والے مری وحشت، زدہ آنکھوں سے پوچھ
موت کے دیکھے ہیں کتنے روپ، کتنی صورتیں

ہوگیا تقسیم در تقسیم ہستی کا وجود
اب سے پہلے زندگی میں انگنت خانے نہ تھے
مجھ پہ ہنستے ہوئے یہ بھول نہ جانا لوگو
رخ ہواؤں کا جدھر تم ہو اُدھر بھی ہوگا
کیسے کیسے ہونگے چہرے بے نقاب
جب بھی اپنے خوں کے پس منظر کھلے

اختر لکھنوی نے المیۂ مشرقی پاکستان کی جس انداز سے نوحہ گری کی ہے اس سے یہ بات پائے ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ انھوں نے غزل کے حُزن کو مرثیہ کا درجہ عطا کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے ان کی شاعری میں یک رنگی اور ایک رخی پیدا ہو گئی ہے جس نے شاعری کے لامحدود امکانات کو محدود کر دیا ہے اور کہیں کہیں احساسات میں شدت کی جگہ تاسف کا انداز نمایاں ہو گیا ہے مگر لہجہ میں شکستگی کی جگہ عزم و حوصلہ جھلکتا ہے۔ انھوں نے آغاز طوفاں کا جو منظر "دیدۂ تر" کی زبانی بیان کیا ہے بعد طوفاں اُس کا منطقی نتیجہ بھی اس طرح نکالا ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں میں اُتر کر خلشِ جاں بن جاتا ہے۔ یہاں اُن کے لہجے میں دل شکستگی کی نہیں، سبق آموزی کی جھلک نمایاں ہے۔

"دیدۂ تر" کی یہ خونچکاں داستاں ورق ورق بکھری ہوئی ہے۔ اختر لکھنوی نے اشعار کی زبان میں جس دردمندی اور جاں سوزی سے اس داستان کی شیرازہ بندی کی ہے وہ انھیں کا حصّہ ہے انھوں نے اپنی "مرثیہ نما" غزلوں کے ذریعہ المیۂ مشرقی پاکستان کے واقعاتی کیفیاتی اور تجزیاتی پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کی ہے دوہری ہجرت کے عذاب کو جس رنگ میں انھوں نے محسوس کیا ہے اُسے دوسروں تک پہنچانے میں وہ کماحقہ، کامیاب و کامران ہوئے ہیں "شہدائے وفا" کے حضور اُن کا یہ نذرانہ ضرور شرفِ قبولیت حاصل کرے گا۔

اختر لکھنوی کی نعتوں کے دو مجموعے "حضور ﷺ" اور "سرکار ﷺ" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں وہ اُن نعت گویوں میں سے ہیں جنھیں جذب و کیف اور بصیرت سرکارِ دو عالم ﷺ کے دربار میں حاضری سے ملی۔ اور وہ اسرار و رموز اور فیوض و تجلیات سے ہمکنار ہوئے۔ جب وہ عمرہ کرنے گئے تو اُن پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی اسی کیفیت میں انھوں نے یہ شعر کہا۔

ہر وقت تھا اک نور کی بارش کا تسلسل
ہر گام پہ اللہ کا جلوہ نظر آیا!!

اُن کی نعتوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی شعر گوئی میں سادگی، سچائی اور حسنِ لطافت کے ساتھ ساتھ فکری تنوع بھی موجود ہے۔ وہ سرکار ﷺ مدینہ کی محبت میں سرشار نظر آتے ہیں انھوں نے جس جذبے، جس کیفیت اور جس استغراق کے عالم میں نعتیہ شعر کہے ہیں اُس کا ہر لفظ وارداتِ قلبی کا آئینہ نظر آتا ہے۔ اور یہ صرف حُبِ رسول ﷺ کی دین ہے۔ وہ کہتے ہیں:

میں جتنا فخر کروں کم ہے میرے آقا نے
مجھے بھی اپنے حساب و شمار میں رکھا

ذکرِ رسول پاک کا اعجاز دیکھیے
اک نعت کیا کہی، سُخن آرائی مل گئی
اِک دن درِ حضور پر اشکوں کی گونج میں
ہم نے پڑھا سلام تو گویائی مل گئی

یاد آتا ہے بہت ہم کو نمازوں کے بعد
درِ اقدس پہ وہ احوال سنانا دل کا
سچ تو یہ ہے ہمیں اچھا نہ لگا اے اختر
ہم سے آگے درِ سرکار پہ جانا دل کا

عمرِ گریزاں کے آخری حصّے میں انھوں نے نعت نگاری جس کثرت اور تواتر سے کی ہے اُس سے وہ سچے عاشقِ رسول ﷺ کی حیثیت سے سامنے آئے وہ بار بار روضۂ رسول ﷺ کی زیارت کے متمنی رہتے تھے اور ہر بار انھیں عمرے کی سعادت نصیب ہوتی تھی۔ جس تاریخ کو یعنی ۲۷ ستمبر کو ان کا انتقال ہوا وہ اُن کے عمرے کے ویزے کا آخری دن تھا۔ وہ اس بار بھی جانا چاہتے تھے مگر خدا نے انھیں اپنے پاس بلالیا۔ نعت گوئی اُن کی شاعری کا سب سے تابناک رخ ہے اس صنفِ سخن میں بھی انھوں نے کمال حاصل کیا۔

اختر لکھنوی کی شعری زندگی کم و بیش چالیس سال پر محیط ہے انھوں نے اس عرصہ میں بڑے بانکپن سے گیسوئے شعر سنوارا اور بڑے درد انگیز لہجہ اور ترنم سے اپنے جذبات و کیفیات کو دوسروں کے دلوں میں اُتار کر روح کو وسعتیں بخشیں۔ درد میں ڈوبی ہوئی وہ آواز جس کو سن کر میں اپنی روح میں بالیدگی محسوس کرتا تھا اور جو اُفق تا اُفق پھیل کر میرے شعور کی کائنات کو مسخر اور میری روح کو اسیر کرلیتی تھی اب وہ خاموش ہو کر مُہیب اندھیرے میں گم ہو گئی ہے مگر اس کی گونج صدائے بازگشت بن کر مجھے آج بھی سنائی دے رہی ہے۔ میرا ذہن اُس کے سحر سے کبھی آزاد نہیں ہوسکتا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

# Serving With Humility

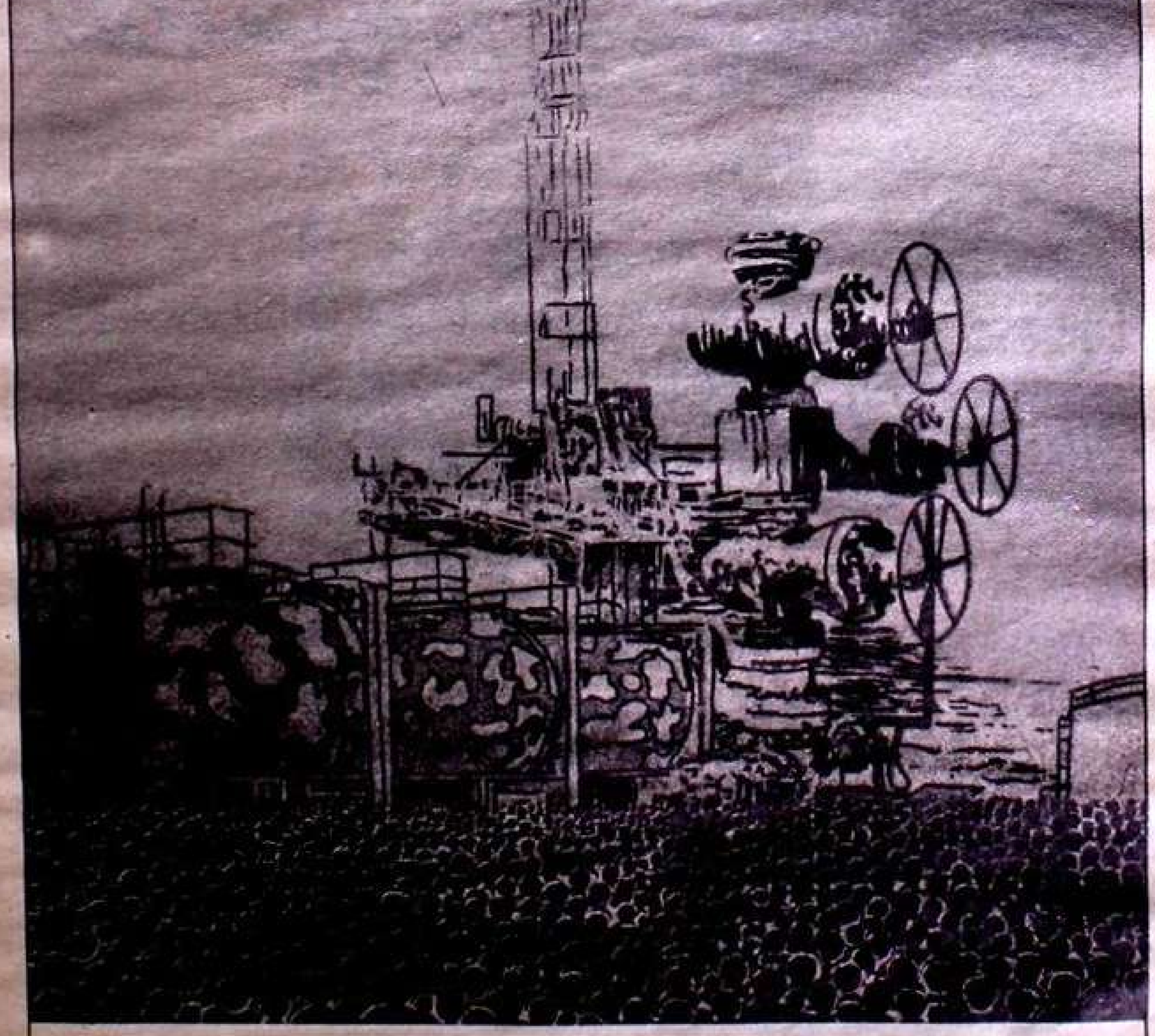

We discovered Sui in 1952 and natural gas supply began in 1955. Pakistan was young and Sui gas was new. It gradually helped to build the nation.

The relationship has remained strong, and PPL remains committed. Its oil and gas discoveries have contributed to the industrialisation of Pakistan, thus improving the quality of life.

Our music is soft, gentle, and the search goes on.

**Pakistan Petroleum Limited**

Discoverers and Producers of Sui Gas

PPL-1/94 (E)

NATIONAL

قومی زبان (۲۷) نومبر ۱۹۹۵ء

# اقبال کی شاعری کی صوتی فضا

شاہدہ یوسف

اقبال کے شعورِ تخلیق کی ان گنت سطحیں ہیں۔ کبھی وہ ان کی علامات و مصطلحات میں ظاہر ہوا ہے تو کبھی منظومات کے پیمانوں میں ان کی قلبی اور باطنی ریاضتوں کا ثبوت فراہم کر رہا ہے۔ اُن کے پُراسرار شعری تجربے تہہ در تہہ معنویت کے حامل ہیں۔ اسالیبِ اظہار پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ تہذیبی اور سیاسی انحطاط کے باجود ان کا لہجہ زندگی سے بھرپور اور توانا ہے۔

اُن کے افکار کی فضائے لطیف میں ہر لفظ کی ایک قدر و قیمت ہے۔ وہ لفظوں کو برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اصوات و حروف کی مطابقت اور یگانگت سے معانی کے ابلاغ میں جو مدد لی جا سکتی ہے اقبال اُس سے کماحقہٗ آگاہ ہیں۔

ابتدائے شاعری میں جب وہ مادی اور محسوس مظاہر و کوائف کی مدد سے زندگی اور ماورائے زندگی کے حقائق پر غور کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ان کی شاعری کی اصوات سے ایک ایسی فضا تعمیر ہوتی ہے جس میں اضطراب اور بے چینی، تحیر و استعجاب، شوخی اور رومانیت کے اَن گنت رنگ ہیں۔ روایات کی گہری چھاپ اور ماضی کے دھندلے نقوش سے اقبال نے اس فضا کا تانا بانا بُنا ہے۔ بانگِ درا کی کچھ منظومات کے اشعار ملاحظہ کیجیے۔

قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل
التجائے ارنی سرخیٔ افسانۂ دل
یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی
جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل
ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب
جل گئی مزرعِ ہستی تو اگا دانۂ دل

نظم بعنوان "دل" بانگِ درا ص ۶۱

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی ﷺ سے شرار بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشاکشِ رمِ دگرما تپ و تراش و خراش
زخاک تیرہ دروں تابہ شیشۂ حلبی
مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید
میانِ قطرۂ نیساں و آتشِ عنبی

نظم بعنوان "ارتقا" بانگِ درا ص ۲۲۳

میرا عیشِ غم، میرا شہد سم، میری بود ہم نفسِ عدم
ترا دل حرم گروِ عجم ترا دیں خریدۂ کافری
دمِ زندگی، رمِ زندگی، غمِ زندگی، سمِ زندگی
غمِ رم نہ کر سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

نظم بعنوان "میں اور تو" بانگ درا ص ۲۵۲

محولہ بالا اشعار میں اقبال کی لفظی جولانیاں خیال خیز بھی ہیں اور فکر انگیز بھی۔ تینوں منظومات میں موضوع کے تطابق اور توافق کے پیشِ نظر خاص قسم کی اصوات کے اجتماع سے ایک غنائیت اور نغمگی کی بے ساختہ اور ہموار فضا کا یہ شعوری یا غیر شعوری اہتمام ان کی قوتِ تخلیق کا کرشمہ ہے۔ اقبال کی ذہنی قوت اور نفسی تجربے بال جبریل میں زیادہ بھرپور انداز میں سامنے آئے ہیں۔ ان کے احساسات پہلے سے کہیں زیادہ قوی اور معنی خیز ہیں اور لہجہ امید افزاء اور بے حد پُروقار ہے۔ اِن اشعار کے تیور اور دم خم دیکھیے۔

کس کی نمود کے لیے شام و سحر ہیں گرم سیر
شانۂ روزگار یہ بارِ گراں ہے تو کہ میں
تو کفِ خاک و بے بصر میں کفِ خاک و خود نگر
کشتِ وجود کے لیے آبِ رواں ہے تُو کہ میں

بالِ جبریل ص ۲۲۸

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دلِ ہر ذرہ میں غوغائے رُستا خیز ہے ساقی
متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

بالِ جبریل ص ۱۰

ضمیر لالہ مئے لعل سے ہوا لب ریز
اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز
بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارث پرویز
حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ ستیز

بالِ جبریل ص ۱۶

ان اشعار کی فضا بڑی توانا اور فعال ہے۔ زندگی کی ساری متنوع کیفیات اِس آئینے میں بے نقاب ہیں۔ اِسی ضمن میں ان کی نظم "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" قابل توجہ ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں، بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

اس نظم میں الفاظ اتنے حیات آفریں ہیں کہ اُن کے باطن سے حیاتِ جاوداں کے سرچشمے پھوٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ صوتی فضا بڑی خلاّق ہے۔ اس فضا کی تعمیر و آرائش میں اقبال نے ان گنت شاعرانہ حربے استعمال کیے ہیں۔ کبھی اِس میں جاندار کیفیات پیدا کرنے کے لیے مکالماتی لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں تو کبھی استفہامیہ۔ اس ضمن میں ان کی نظم "پیر و مرید"، "جبریل و ابلیس" اور "الارض للہ" قابل مطالعہ ہیں۔

مرید ہندی

چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

پیر رومی

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

بالِ جبریل ص ۱۳۴

مرید ہندی

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں
ساحر افرنگ کا صید زبوں

پیر رومی

مرغِ پر نارُستہ چوں پَراں شود
طعمہ ہر گربۂ دراں شود

بالِ جبریل ص ۱۳۶

جبریل

ہمدم دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بو

ابلیس

سوز و سازِ درد و داغ و جستجو و آرزو

جبریل و ابلیس

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟

(الارض للہ)

یہ اشعار شاعر کے تجربے کی مختلف سطوح کے ترجمان ہیں۔ ان میں غیر معمولی توانائی اور تاثیر اسی وجہ سے ہے کہ ان کا ہر لفظ اپنے اندر انوکھے معنوی مضمرات اور گہرائیاں رکھتا ہے۔ ان کا شعری تجربہ ان کے تخیل و ادراک اور ان کے اسالیبِ اظہار کی وساطت سے جب آگے بڑھتا ہے تو کیفیت کا ہر جز زندہ اور جاندار تشبیہات اور فکر انگیز استعارات کی مدد سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان کے اس ہنر میں منطقی سجائیاں بھی ہیں اور تخیلی صداقتیں بھی۔ ان کی شاعری کی فضا مجہول و معکوس نہیں بلکہ اس میں بلا کی وسعت اور بے پایانی ہے ان کی شاعری ایک ایسی فضا کو ترتیب دیتی ہے جو آسمان کے گنبدِ بے در میں ارتعاش پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور جس میں پہاڑوں کے دل پگھلا دینے کی صلاحیت ہے۔ "جواب شکوہ" کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا
اشک بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں چیر گیا نعرۂ مستانہ ترا
کس قدر شوخ زباں ہے دل دیوانہ ترا

اس فضا میں سچائی بھی ہے اور سوز بھی۔ اس سوز کی اساس اقبال کے گہرے اور گمبھیر جذبے ہیں۔ جنھوں نے ان کی قلب و جاں میں حشر برپا کر رکھا ہے۔ بالِ جبریل کی اس پہلی ہی غزل کے تیور اور اقبال کے لہجے کی خوبو اور آن بان ملاحظہ کیجیے۔

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلۂ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں!
گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند
میری فغاں سے رُستخیز کعبہ و سومنات میں

بال جبریل ص ۵

یا پھر اس غزل کو دیکھیے

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر اُٹھتے ہیں حجاب آخر
تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر

بال جبریل ص ۵۲

ان اشعار میں اقبال کے جذبوں کی برقی رو لہو بن کر دوڑ رہی ہے۔ ان کے اشعار کو پڑھ کر قلب و جاں میں ایک حدت اور تاب و تب کا احساس ہوتا ہے۔ غرضیکہ بال جبریل کی غزلیات و منظومات کی صوتی فضا اُن کے بحرِ تخیل اور اسلوبِ اظہار کا ایک سیل تُند رو ہے جس کے تہور اور بوقلمونی کے سامنے معجزۂ اظہار کی ہر جہت دست بستہ کھڑی ہے۔ حیات و کائنات اور نشاط و غم اُن کے جمالیاتی وجدان کا حصہ بن چکے ہیں۔ بالِ جبریل کی ساری فضا، "سوز و ساز و درد و داغ و آرزو و جستجو کی تفسیر ہے۔ ان اشعار کے تیور طنطنہ دیکھیے۔

یہ مشتِ خاک یہ صرصر یہ وسعتِ افلاک
کرم ہے یا کہ ستم ہے یہ لذتِ ایجاد
ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل
یہی ہے فصلِ بہاری یہی ہے بادِ مراد

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کرسکے آباد
میری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشتِ سادہ وہ تیرا جہان بے بنیاد

بالِ جبریل غزل ص ۸

بالِ جبریل ہی میں ان کی طویل منظومات "ساقی نامہ"، "ذوق و شوق" اور "مسجد قرطبہ" اظہار و بیان کی معجزاتی کیفیات اپنے اندر رکھتی ہیں۔ ساقی نامہ کے متحرک اور رواں دواں مصرعے ایک ایسا آہنگ پیدا کرتے ہیں جو کبھی تند و تیز اور بلند آہنگ ہے تو کبھی رواں دواں اور ہموار دیکھیے۔

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی، سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ان اشعار میں ایک سیلِ الفاظ و معانی ہے جو جامد و ساکت اور مہیب اشیاء کے دل توڑ کر آگے بڑھ رہا ہے۔ مظاہر فطرت ان کی فنکاری اور شاعرانہ استعداد کی بدولت جاندار اور فعال پیکروں میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس طرح اُن کے اشعار کی صوتی فضا میں ایک فکری جدت اور ایک بسیط تجربہ شامل ہو جاتا ہے۔ ان کے ساقی نامے کے باطنی اور خارجی آہنگ کی ترتیب میں روحِ معانی لفظوں کی گود میں ہمکتی اور کھیلتی چلی جاتی ہے۔ اس میں شاعر کی فکری اُٹھان اور جذبے کا وفور ہمالہ کے دامن سے اُبلتے ہوئے چشموں کی یاد دلاتا ہے۔ دیکھیے۔

مذاق دُوئی سے بنی زوج زوج
اُٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
اُبھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات
بڑی تیز جولاں بڑی زود رس
ازل سے ابد تک رمِ یک نفس

یہ آوازیں بے ساختگی نہیں بلکہ شعریت اور حساسیت ان کا جوہر ہے ان کی تعمیر جن الفاظ و اصوات سے ہوئی ہے وہ روحِ معانی سے معمور ہیں۔ مسجد قرطبہ کے پہلے بند کے حروف و اصوات کے رگ و ریشے سے عرفان و آگہی اور حقائق و معارف کے سرچشمے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے فکر و خیال کے پُر شوکت پیکر الفاظ و اصوات کے جلوس میں زمیں پر اُتر رہے ہیں۔

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلہ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلہ روز و شب تارِ حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلہ روز و شب ساز ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلہ روز و شب صیرفیٔ کائنات

مذکورہ بند میں "س" اور "ش" کی نرم رو اور خیال آفریں آوازیں زمانے کے تسلسل کو بڑے گمبھیر اور فلسفیانہ انداز میں واضح کرتی ہیں۔ اس بند میں "س، ش، ث اور ص" کی قریب المخرج آوازیں اپنے اندر ایک پُراسرار معنویت رکھتی ہیں۔ ان کی نظم "ذوق و شوق" میں اصوات کے اہتمام سے ایک خاص قسم کی کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی فضا جس میں ان گنت سمتی، بصری اور حسی پیکر ہیں شدت کی سرور آفریں صبحوں کی تازگی اور صحرا کی وسعتیں ہیں اور پھر نظم کے آخر میں اقبال کی روح کا سارا سوز و گداز ان مصرعوں میں سمٹ آیا ہے۔

گرمیٔ آرزو فراق
شورش ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق
قطرہ کی آبرو فراق

اُن کی شاعری کا لب و لہجہ بہت گرم ہے۔ ان کے باطن کی ساری گرمی اور ان کے نفس کا سارا سوز ان کی شاعری میں تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ فضا زندگی سے بھرپور ہے اور ماورائے حیات و کائنات کے سارے تیور اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس فضا میں ہر لمحہ نئی آرزوؤں کی رُستاخیز بپا ہے۔ تگ و دو کے نئے تقاضے ہیں۔ نئے زمانوں اور نئے جہانوں کی جھلکیاں ہیں۔ ملاحظہ کیجیے۔

مانند صبا خیز و وزیدن دگر آموز
دامانِ گل و لالہ کشیدن دگر آموز
اندر دلکِ غنچہ خزیدن دگر آموز

تختِ جم و دارا سر راہے نفر و شند
ایں کوہِ گراں است بکا ہے نفرو شند
باخونِ دل خویش خریدن دگر آموز

زبور عجم ص ۱۱۵

یا پھر زبور عجم ہی کی ایک اور نظم دیکھیے جس میں ہنگامہ آخریں اور پُر آشوب آوازوں کا سہارا لیا ہے۔ انھوں نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ایسے حروف اور ایسی اصوات منتخب کی ہیں جن سے جوشِ زندگی اور نشاطِ آرزو کا احساس ہوتا ہے۔

اے غنچۂ خوابیدہ چوں نرگسِ نگراں خیز
کاشانۂ ما رفتِ بتاراجِ غماں خیز
از نالۂ مرغِ چمن از بانگ اذاں خیز
از گرمیٔ ہنگامہ آتش نفساں خیز
از خواب گراں خواب گراں خوابِ گراں خیز
از خواب گراں خیز!

دریائے تو دریاست کہ آسودہ چو صحراست
دریائے تو دریاست کہ افزوں نشد و کاست
بیگانۂ آشوب و ستنگ است چہ دریا ست
از سینہ چاکش صفتِ موج رواں خیز
از خواب گراں، خواب گراں خوابِ گراں خیز
از خواب گراں خیز!

ان کا تخیل اپنے اندر جذباتی اور مصوّرانہ اسالیب اظہار کی ساری قوتیں اور امکانات رکھتا ہے۔ ان کی خیالی تصاویر بڑی سیراب اور شاداب ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری کی فضا میں ایک ایسی موسیقی ترتیب پاتی ہے جس میں کائنات کے تواتر و تسلسل کی ارتقاء پذیر جہتیں ہیں۔ دیکھیے۔

جلوہ گہہ شہود را، بتکدہ نمود را
رزم نبود و بود را، کشمکش وجود را
عالم دیر و زود را، می نگریم و می رویم

پیام مشرق ص ۲۶۸-۲۶۹

خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گل رسید
باد بہاراں وزید، مرغ نوا آفرید
لالہ گریباں درید، حسن گل تازہ چید
عشق غمِ نو خرید

خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گل رسید

ان اشعار میں بحور کے ارکان کے رد و بدل سے اور اوزان کو نصف کر دینے سے جو موسیقی اور غنائیت پیدا کی گئی ہے اس سے انسان کے قوائے شوق کی تسکین بھی ہوتی ہے اور مفاہیم و معانی کا ابلاغ بھی۔ پیامِ مشرق کی بیشتر منظومات کا آہنگ اپنے اندر بلا کا سحر رکھتا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں الفاظ کی در و بست سے جو صوتی فضا تعمیر کی ہے۔ وہ ان کی فکر کے ابلاغ میں ان کی حد درجہ معاونت کرتی ہے ان کی چھوٹی بحروں کی منظومات سے جو صوتی فضا تعمیر ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے اثبات و استحکام کا درس دیتی ہے اور کائنات کے ادراک کا حوصلہ بھی۔ اس میں زندگی کی ہمہ گیری ہے۔ یہ فضا زندگی کی محبت سے معمور ہے۔ یہاں تراکیب کی بست و کشاد اور لہجے کی کھنک سے ایک روحانی کیف اور ذہنی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اُن کے یہاں آوازوں اور الفاظ کا اجتماع مہمل اور مبہم نہیں۔ بلکہ مربوط اور منظم ہے۔ اس سلسلے میں پیام مشرق میں ہی اقبال کی ایک اور نظم کا جائزہ لینا خالی از علت نہ ہوگا۔ دیکھیے اس سے ایک کیف نغمگی کا اظہار ہوتا ہے۔

لالہ ز خاک برد مید موج بآبجو تپید
خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر
زخمہ بہ تارِ ساز زن بادہ بہ ساغریں بریز
قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر
دخترِ کے برہمنے لالہ رُخے سمن برے
چشم بروئے اُو کشا باز بخویشتن نگر

پیام مشرق ص ۱۳۳

اس نظم میں ست رو بحر سے انھوں نے ایسی فضا تعمیر کی ہے جس میں قاری کو فکری بصیرت، تفکر اور سوچ، بچار کے مواقع میسر آتے ہیں۔ بحر کی ست روی کے باوجود ان کے لہجے کی تمکنت دل کو ایک ایسی طمانیت اور تازگی عطا کرتی ہے جو بڑی روح پرور اور امید افزا ہے۔ اس کے علاوہ ان اشعار میں بھی بحر کی ست روی کے باوجود ان کے لہجے کی آن بان اور تمکنت دیدنی ہے۔

خواجہ از خونِ رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب ! انقلاب ! اے انقلاب !
اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
ابر من اندر جہاں ارزاں و یزداں دیر یاب
انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!

اقبال کی اس شاعرانہ فضا میں شورش حیات اور تگ و دو کے سارے عناصر ہیں۔ اس میں دینی اور دنیوی احساس آکر یکجا ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شعری فضا کی تعمیر میں ان گنت شاعرانہ حربے استعمال کیے ہیں۔ کبھی بحور و اوزان کے ردو بدل سے، کبھی ان کے اختلاط باہمی سے کبھی اور بیتی تجربات کی ندرت سے کبھی تصورات و افکار ترفع سے اور کبھی تمثیلی، ڈرامائی اور مکالماتی طریقہ اظہار سے، کبھی استعارات و تشبیہات کے انوکھے پن سے اور کبھی تلمیحات اور صنائع بدائع کے رنگ و آہن سے یا پھر کبھی الفاظ و حروف کی تکرار سے اور کبھی ایک ہی مصرع میں ہندی، عربی، فارسی اصوات کے اجتماع سے ایک ایسا آہنگ ترتیب دیتے ہیں جو ان کی شاعرانہ فضا میں ایک خاص طرح کی غنائیت پیدا کرتا ہے جیسے:

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اُودے اُودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

کبھی یہ آوازیں نرم رو ہوتی ہیں تو کبھی بلند آہنگ، کبھی معتدل، لطیف اور سبک سیر، کہیں سرور انگیز اور دل آسا۔ غرضیکہ ان کا نغمۂ شوق ان کے لہجے میں بڑی متنوع، بوقلموں اور اضطراب انگیز کیفیات پیدا کرتا ہے۔ کبھی اس میں حدی خوانوں کی ندا، کبھی پہاڑی گیتوں کی سی گونج، کبھی درد و شوق کے جذبات کا وفور۔ غرضیکہ اقبال کے جمالیاتی وجدان کے سارے رنگ اس میں موجود ہیں۔ اقبال نے اس فضا کی تعمیر تجربے کی سچائی، تخیل کی ندرت اور فکر کی گہرائی سے کی ہے۔ اسی لیے ان کی شاعرانہ فضا میں زندگی کی حرارتیں اور توانائیاں ہیں۔ وہ جب تک اپنی فکر کو اپنے قلب و جاں پر وارد نہیں کر لیتے تب تک اُسے سپردِ قلم نہیں کرتے اظہار کے پیمانوں پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے ان کے لہجے کی خود اعتمادی کا عالم اس وقت بھی دیدنی ہوتا ہے جب وہ اپنی شاعری میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اعتماد، یقین واریفتگی اور اپنائیت کے احساس سے ان کا حرف حرف چمک اٹھتا ہے ان کی ذہنی جودت اس لمحے اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

یا مسلماں رابدہ فرماں کہ جاں، بر کف بنہ
یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانے آفریں
یا چناں کُن یا چنیں

یا برہمن را بفر مانو خداوندے تراش
یا خود اندر سینۂ زُنّار یاں خلوت گزیں
یا چناں کُن یا چنیں

یادگر آدم کہ از ابلیس باشد کمرک
یادگر ابلیس بہر امتحانِ عقل و دیں
یا چناں کُن یا چُنیں

ان اشعار میں ایک ازخود رفتہ عاشق کی ذات مطلق سے جسارت آمیز شوخی کا حال بھی کھلتا ہے۔ اور ایک دردمندانہ اور ذکی الحس انسان کی بیتابی بھی آشکار ہوتی ہے۔ اس نظم میں اقبال کی عرضداشت ایک MONOLOGUE کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو نظم کی فضا بندی میں ایک تحیر زا کیف پیدا کرتی ہے اس لیے کہ حیات و کائنات کے دھاروں کو اپنی مرضی سے چلانے کا خواہش مند انسان جس اعتماد و یقین سے حُسنِ مطلق کے حضور اپنے مشورے پیش کر رہا ہے۔ وہ قاری کے استعجاب اور حیرت کو بڑھاتا ہے۔ اس نظم میں تراکیب کی بست و کشاد اور شاعر کے لہجے کی کھنک سے ایک روحانی کیف اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ان کے یہاں آوازوں اور الفاظ کا اجتماع مہمل اور مبہم نہیں بلکہ مربوط اور منظم ہے۔ ان اشعار کی صوتی فضا سے زندگی کے اثبات و استحکام کا درس بھی ملتا ہے اور کائنات کے ادراک کا حوصلہ بھی۔ نظم کا مجموعی آہنگ مصرع در مصرع منتقل ہوتے ہوئے قلب و جاں پر ایک تحیر خیز ہیبت طاری کرتا ہے۔ ان کے تخیل کی ضرب کلیمی کی بدولت الفاظ کی جامد چٹانوں سے معانی کے دھارے پھوٹنے لگتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اظہار کے سارے وسائل ان کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں جہاں تشبیہہ و استعارے اُن کے فکر و استدلال کو نئی نئی جہتیں عطا کرتے ہیں۔ اس فضا کے رگ و ریشے میں ان کے گرم خون اور فعال ذہن کی تخلیقی صلاحیتیں بے نقاب ہیں۔ انھوں نے اپنے افکار و تصورات کے اظہار کے لیے زبان کے مروجہ سانچوں میں خاطر خواہ تبدیلیاں کی ہیں۔ تراکیب و اصطلاحات کے مفاہیم میں بھی توسیع کی ہے اس لیے ان کی شاعری کی فضا میں بے جان تمثالوں کی سنگینی اور منجمد کیفیات کا جمود نہیں بلکہ متحرک اور توانا مناظر اور زندگی سے بھرپور تمثیلیں ہیں۔ زبور عجم اور جاوید نامہ تک آتے آتے ان کے اسالیب اظہار پر ان کی استعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ ان کی شاعرانہ فضا میں بہت سے نئے رنگوں کی دل آویزی نظر آتی ہے۔ دیکھیے۔

رقصِ تن ازحرف او آموختند
چشم را از رقصِ جاں بردوختند
رقصِ تن در گردش آرد خاک را
رقصِ جاں برہم زند افلاک را
علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست
ہم زمیں، ہم آسماں آید بدست

جاوید نامہ درخطاب بہ جاوید سخنے بہ نژاد نو

یا پھر یہ اشعار

گفتم ایں کاشانۂ از لعل ناب
آنکہ می گیرد خراج از آفتاب
ایں مقام ایں منزل کاخِ بلند
حوریاں بردرگہش اِحرام بند

قصر شرف النساء (جاوید نامہ)

یہ فضا اقبال نے اپنے جذبے کی گرمی گداز اور گھلاوٹ سے تعمیر کی ہے۔ اس فضا میں تہذیب حجاز کے سارے رنگ، ہیں۔ حیات و ممات کی ساری رمزیں، ہیں۔ کشف و الہام اور عصری سچائیوں کی بازگشت ہے۔ ان کے یہاں فارسی و عربی کے پُر شکوہ الفاظ، مظاہرِ فطرت کے توانا (IMAGES)، انسان کے ذوقِ ارتقاء کا جوش و خروش اس فضا کو ایک خاص طرح کا اعتبار بخشتے ہیں۔ اس فضا میں صلابت بھی ہے اور نزاکت بھی۔ اصوات و الفاظ کا زیر و بم، قوافی و ردائف کی موسیقیت اور غنائیت، لفظوں کی دروبست، تراکیب کی نشست و برخاست، تمثیلی پیرایہ ہائے اظہار، الفاظ و معانی کا تناسب و توازن خیال و فکر کی روانی، دلخراش سانحوں کی تنظیم اور پھر ان کے اسلوب و آہنگ کا معجزانہ بہاؤ۔ اس فضا میں حیات کی تمام تر شورشیں اور ہنگامہ خیزیاں ہیں۔ اس فضا میں زندگی کے تجربات کی بصیرت بھی ہے اور محتم بالشان سچائیاں بھی قرآن و سنت کے فیضان نے اس کو بُقعۂ نور بنا رکھا ہے اس کے RHYTHM اور آہنگ میں حجازی اور اسلامی روایات تکمیل پذیر ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری کی صوتی فضا صرف غنائیت، موسیقی اور نغمہ و آہنگ کے کوائف ہی اپنے اندر نہیں رکھتی بلکہ ایک زوال یافتہ قوم کے ایوانوں میں صُورِ اسرافیل کی طرح گونج رہی ہے۔ اس فضا میں عہد گذشتہ کی بصیرت بھی ہے اور عہدِ آئندہ کی گہری معنویت کا احساس بھی۔ ان کی شاعری محض خوش لحن حروف و اصوات کا کرشمہ ہی نہیں۔ اس فضا کو جاندار، دلکش اور حیات آفریں بنانے کے لیے شاعر نے مشرق و مغرب کے فلسفے کا جوہر اس میں انڈیل دیا ہے۔ اسلامی تاریخ کے جدوارتقاء کا ہر مرحلہ، نفسِ انسانی کے سارے بھید، تہذیب و ثقافت کا ہر رُخ مظاہر فطرت کی ہر جہت اِس فضا کو وقیع اور معتبر بناتی ہے۔

مطبوعات انجمن ترقی اردو کے لیے لکھے گئے پیش لفظ کا مجموعہ

حرفے چند

از

جمیل الدین عالی

قیمت حصہ اوّل =/۱۰۰ روپے حصہ دوم =/۱۲۵ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو پاکستان ڈی ۱۵۹۔ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی۔ ۷۵۳۰۰

قومی زبان (۳۹) نومبر ۱۹۹۵ء

# انتظار حسین کا "آگے سمندر ہے"

پروفیسر ریاض صدیقی

"کوا بہت اداس ہوا۔ ٹھنڈا سانس بھر کر بولا، مجھ کوے کی قسمت میں گھر نہیں ہے اور پھر پہلے کی طرح ٹہنی پر بسیرا کرنے لگا۔"

"اب بپھرتا ہوا سمندر ہمارے پیچھے نہیں ہمارے سامنے ہے اور ہم نے کشتی نہیں بنائی ہے"

آقا حسین: بھائی مجید الحسینی تمھیں آگے کیا نظر آتا ہے۔

مجو بھائی: سمندر

آقا حسین میرا منہ تکنے لگے کہنے لگے بھائی میں نے سنجیدگی سے یہ سوال کیا ہے؟

مجو بھائی: قبلہ اقن صاحب "میں نے بھی سنجیدگی ہی سے کہا ہے۔"

(انتظار حسین کے ناول "آگے سمندر ہے" سے۔)

۱۔ یہ چند فقرے نہ ہی کوئی کہانی ہیں جو دادی اماں بچوں کو سناتی ہیں اور نہ مزاح کی تہہ میں چھپے ہوئے طنز ہیں جو پڑھنے والوں کو ہنسنے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں یہ تو ذہن کے بند دروازوں پر دستک ہیں اور ان کا ماخذ انتظار حسین کا نیا ناول "آگے سمندر ہے" ہے۔ ان فقروں کی معنوی سمت کی صحت موجودہ مقامی اور بین الاقوامی تناظر میں صحیح نہیں کہی جا سکتی ہے تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ قابل توجہ ہے کہ اگر ہم اپنے سیاسی و سماجی اور فکری انداز نظر کا قبلہ درست نہ کر سکے تو کوے کی طرح موم اور نمک ہی کے گھر بناتے رہیں گے۔ بصورت دیگر آج کی دنیا میں ایک مضبوط گھر بنا لینا کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ "آگے سمندر ہے" صحیح سمت نمائی کا یہ فرض پورا نہیں کرتا ہے بلکہ پڑھنے والوں کو اصول حقیقت کے بجائے خواہشات کی تکمیل کے لیے جدوجہد کی طرف دھکیلتا ہے۔

۲۔ ناول کا نام بجائے خود ایک علامت ہے۔ یہ فقرہ کبھی ہمارے ملک کے سابق صدر محمد ایوب خان نے ادا کیا تھا اور کچھ اس طرح ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کے احساس کا حصہ بن گیا جس طرح بڑے شاعروں کے چند اشعار زبان زد خاص و عام ہو کر آفاقی جہت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس ناول پر جس کو ناول نگار کی سب سے اعلیٰ تخلیق بھی کہہ سکتے ہیں روزنامہ دی نیوز انٹرنیشنل کراچی میں ثروت علی نے لکھا ہے کہ مہاجر مسئلہ ایک ایسا سوال بن گیا ہے جس کا نہ کوئی جواب ہو سکتا ہے اور نہ حل (RESOLUTION) اور یہی "آگے سمندر ہے" کی سمت بھی ہے۔ فنی و تخلیقی خوبیوں سے قطع نظر ناول میں نمایاں کمی یہی ہے کہ ناول نگار نے پورے قصے کو جس کی بنت میں قدیم داستانی۔ دیومالائی اور سینہ بہ سینہ چلی آنے والی کہانیوں کے اجزا شامل

ہیں اس انداز سے تمام کر دیا ہے کہ مسئلے کا کوئی حل نظر ہی نہیں آتا ہے۔ فلسفہ، سائنس اور اصول حقیقت ہو یا تاریخ کی جدلیاتی میکانزم کسی بھی حوالے سے کوئی صورت حال لاینحل کیونکر ہو سکتی ہے۔

موجودہ دور کی صورت اب سر سے پیر تک بدل چکی ہے۔ شعر ہوں یا ادب اگر وہ معاصر علوم اور سائنسوں کے مختلف شعبوں اور ان کی شاخوں و شاخچوں سے قدم ملا کر چلنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں۔ تو پھر وہ فوری و اہم سیاسی و سماجی اور اقتصادی و ثقافتی مسائل کی تجزیاتی تحلیل کر کے کسی صحیح سمت کی نشاندہی کرنے سے یقیناً معذور ہوں گے۔ استار حسین کا ناول بھی اس صحت مند بیج جیسا ہے جس کے اندر جینی (GENETIC) وجوہ کی بنا پر اکھوے یعنی (RADICLE AND PLUMULE) نہ بن سکے ہوں۔ اس کی تہیں کھولتے جائیے اس میں سب کچھ ملے گا آخر میں اکھوے نہیں ملیں گے۔ ۱۹۷۳ء تک ایسی صورت حال موجود تھی جو اکھوے جیسی تھی اگر اسے زرخیز مٹی اور مناسب پانی و ہوا ملتا تو یقیناً کونپلیں نکلتیں مگر اس کے بعد وقت کہیں آگے کی طرف نکل گیا اور معروضی صورت حال میں بڑی تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ ناول کے حاوی کردار محبو بھائی: کے ہرے بھرے فقروں کی تہہ اسی حقیقت کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں۔

"لگتا نہیں ہے یہ وہی لوگ ہیں۔ (جواد)

"وہی لوگ۔ محبو بھائی نے تھوڑا تامل کیا۔ پھر بولے۔ اماں باؤلے ہوئے ہو جو انھیں ڈھونڈ رہے ہو۔ وہ لوگ اب کہاں جب وہاں سے نکل آئے تو وہ لے کیسے رہتے۔ وہاں ندیوں کی مٹی تھی یاں سمندر کی ریت ہے۔"

تو پھر انھیں دیکھنے کے لیے وہاں جانا پڑے گا؟ (جواد)

"محبو بھائی ہنسے۔ مگر پیارے یہ نہ ہو کہ جب وہاں پہنچو تو پتہ چلے کہ وہ لوگ اب وہاں بھی نہیں ہیں۔

وہ کیوں۔ (جواد)

"زمانہ۔ میاں زمانہ

ناول کا موضوع کراچی میں ہندوستان سے آ کر آباد ہونے والوں کے سیاسی و اقتصادی مسائل ہیں نہ کہ ثقافتی و تاریخی اور لسانی کیونکہ ان کی زبان بھی اب ان کے قبضے سے نکل کر دوسرے علاقوں کی گرفت میں آ چکی ہے۔ کراچی ایک ہرا بھرا جدید صنعتی و بین الاقوامی شہر ہے اس کا شمار دنیا کے چند بڑے صنعتی شہروں میں ہوتا ہے اپنے ملک کا وہ سب سے بڑا شہر بھی ہے جہاں کی آبادی اس وقت ایک کروڑ بیس لاکھ ہے اسے عروس البلاد بھی کہا جاتا ہے اور ملک کی شہ رگ بھی۔ اس کو حکمراں بھی خوب ملے ایک تو دارالخلافہ ہی اٹھا کر لے گئے تاکہ قومی سیاست کے دھارے سے اردو بولنے والے آبادکاروں کو دور کیا جا سکے اور مرکز پنجاب و سرحد کے بیچ قائم ہو۔ اس دور میں ملک کی بڑی اکثریت یعنی بنگالیوں نے اس فیصلے پر ناگواری کا اظہار کیا گویا اس فیصلے نے بنگال کے علاحدہ ہو جانے کے امکان کو تحریک فراہم کی۔ دارالخلافہ تو چلا گیا مگر شہر کو تو جیسے پر لگ گئے ہوں سارے ملک کی خلقت اپنے آبائی علاقوں کو چھوڑ کر کراچی کی طرف آنے لگی۔ جن لوگوں کے پاس دولت تھی انھوں نے یہاں بڑی صنعتیں لگائیں مگر وہ عوام یعنی سندھی اور بلوچ جو سندھ کے اصل شہری تھے جس حالت میں تقسیم کے بعد تھے اب اس سے بدتر حالات میں ہیں۔ کراچی سے رقابت کی بنا پر ہر آنے والی حکومت نے شہر کی آبادی کو ہمیشہ اصل کے مقابلے میں آدھا کر کے بتایا۔ اُس وقت سرکاری اعداد و شمار کل آبادی کو پچاس لاکھ بتاتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے ادارے بین الاقوامی مالیاتی تنظیمیں اور وہاں کے رسائل و جرائد مثلاً ٹائم اور نیوز ویک ایک کروڑ بیس لاکھ ہی بتاتے ہیں۔ کراچی کا علاقہ موئن جوڈارو اور ہڑپا سے پہلے کے آثار بھی پیش کر چکا ہے (دی بیلچ سوئیلائزیشن آف بلوچستان مصنفہ فیئر سروس) مگر حکومتی ذرائع اور اہل نظر مدعی ہیں کہ کراچی تو دو سو سال پہلے بس بلوچی مچھیروں کی

چھوٹی سی بستی تھی یعنی بلوچستان کا علاقہ تھی۔ ماہرین آثار قدیمہ خصوصاً فیر سروس نے بھی اسے بلوچستان ہی کا علاقہ قرار دیا ہے (آن آرکیالوجی مرتبہ ریاض صدیقی مطبوعہ اندمس پبلی کیشنز کراچی ۱۹۹۴ء) اب کہ کراچی پر بلائے ناگہانی نازل ہوئی تو باہر سے یہاں آکر صنعتیں لگانے والوں نے انھیں اکھاڑ کر فیصل آباد کا رخ کیا۔ جب وہ یہاں رہے اس شہر کو منی پاکستان کہلواتے رہے اور اب کہتے ہیں کہ یہ آفت زدہ ہے۔ یہی آفت زدہ شہر جو ناول کا موضوع بھی ہے تماشہ بنا ہوا ہے اور خلقت اسے خاموشی سے دیکھ رہی ہے۔ پچھلے دنوں بعض کونے کھدروں سے یہ آواز بھی سنائی دی کہ اتنے بڑے انسانی المیے کے باوجود ملک کا اہلِ نظر طبقہ چپ سادھے بیٹھا ہے۔ لکھنے والے کبھی عراق کے بارے میں بہت فکرمند تھے پھر بوسنیا اور چیچینیا کے بارے میں بھی انھوں نے تشویش کا اظہار کیا۔ افغانستان کے بارے میں وہ اسی قسم کی آرا کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خون مسلماں ارزاں ہوگیا ہے اور مغربی قوتیں مسلمانوں کو ختم کردینے پر تلی بیٹھی ہیں مگر کراچی اور حیدرآباد میں روزانہ مرنے والے عوام بھی تو مسلمان ہی ہیں جن کے بارے میں ناول نگار نے اپنی یادوں کو مجتمع کرتے ہوئے لکھا ہے اور سچ لکھا ہے کہ

"پاکستان آگیا۔ اندھیرے میں ایک مسرت بھری آواز۔ میں نے کہا اللہ تیرا شکر ہے۔

"اماں اب گولی کی بات مت کرو۔ پاکستان آگیا ہے یہاں تمھیں کوئی بندوق نہیں دکھائے گا"

"اچانک کوئی اونچی آواز سے کہتا ہے۔ پاکستان اور پورے ڈبے والے مِل کر نعرہ لگاتے ہیں۔ "زندہ باد"

"اماں دن کیا ہے"

"جمعہ لگ چکا ہے"

"مبارک دن ہے"

"اے میاں۔ چاند کی کون سی ہے"

"ذی الحج کی آج نو ہوگئی ہے اب کے حج اکبر ہے۔ تاریخ بھی مبارک ہے۔"

مولانا محمد علی جوہر نے ایک بار مولانا ابوالکلام آزاد کی نہ ختم ہونے والی خاموشی پر طنز کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ تو "ابو السکوت" بن کر رہ گئے ہیں۔ اس قسم کی پراثر برجستگی "آگے سمندر ہے" کے کردار محبوب بھائی کے یہاں بھی دکھائی دیتی ہے انتظار حسین اس لیے داد و تحسین کے حق دار ہیں کہ انھوں نے نہ صرف سکوت کو توڑا ہے بلکہ اتنے بہ گیر انسانی مسئلے کو ادب و تاریخ کے تانے بانے میں اُتار کر اسے محفوظ کیا ہے۔ اس موضوع کا احاطہ گو کہ چند افسانہ نگاروں نے ضرور کیا مگر اس کے لیے زیادہ موزوں وسیلہ ناول ہی ہوسکتا تھا سو یہ ضرورت ناول نگار نے پوری کردی "آگے سمندر ہے"، "آگ کا دریا"، "سنگم" اور "آنگن" جیسے ناول کی قطار میں ایک اہم اضافہ بھی ہے۔

اپنے دورِ اول کے افسانوں اور ناولوں سے لے کر "آگے سمندر ہے" تک انتظار حسین اپنے کھوئے ماضی ہی میں جی رہے ہیں۔ یہ ماضی اب اجتماعی و انفرادی لاشعور کا حصہ بن گیا ہے اور وہاں بھی موجود نہیں جہاں کبھی وہ زندہ و فعال ہوا کرتا تھا۔ ان کا ایک ہندوستانی کردار جو ایک پاکستانی کردار جواد کا بھائی بھی ہے پاکستانی کرکٹ کی جیت پر بزرگوں کی طرف سے دیے گئے لڈو کو واپس کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"بھائی جان آپ بتائیے میں نے کچھ غلط کیا۔ غیر قوم کی ٹیم جیتی ہے۔ میں کیوں لڈو کھاؤں۔"

"ارے کم بخت یہ تیرا بھیا یاں آیا ہے۔ یہ آج غیر قوم ہوگیا۔ تم ایک خاندان کے پوت ہو"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ قومیں تو دو ہیں"

یہ ہے ہندوستان کے ان مسلمانوں کی سائیکی جو تقسیم کے بعد پیدا ہوئیں اور دیو ناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی اردو کے ذریعے شعور حاصل کیا جسے وہاں ہندی کہا جاتا ہے وہ اپنے ماضی کے خول کو توڑ کر اپنے حال میں زندہ ہے انتظار حسین سمجھ رہے ہیں کہ ہندوستان سے آکر سندھ میں آباد ہونے والوں کی نسلیں ابھی وہیں ہیں جہاں ان کے بزرگ تھے۔ ہجرت کر کے آنے والی اور کراچی شہر کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچانے والی نسل ختم ہو چکی ہے بلکہ اس کا جادو بھی ٹوٹ چکا ہے دو چار جو باقی رہ بھی گئے ہیں گمنامی (ISOLATION) کی زندگی گزار رہے ہیں اور ان کا رویہ اب معذرت خواہی کا ہے، ہجرت کرنے والوں کی نسلوں کے گھروں میں اب اودھی پوربی کھڑی اور گنوارو بولیاں بولنے والے باقی نہیں رہے ہیں۔ ان کے تجربوں میں صنعتی و بین الاقوامی شہر کے مظاہر یہاں کی تعلیم گاہیں۔ سمندر کے کنارے دور دور تک پھیلی ہوئی پسماندہ بستیاں یعنی (GHETTOS) یہاں کے کاروباری ادارے اور فضا ہیں۔ یہ نسل تو عروس البلاد کے مزاج میں رچی بسی ہوئی ہے۔ ریستورانوں میں سوفٹ (SOFT) ڈرنک سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ انگریزی فلمیں دیکھتی ہے۔ پاپ گانوں کی دلدادہ ہوتی جارہی ہے۔ اور بروسٹ و فاسٹ فوڈ استعمال کرتی ہے۔ یہ درحقیقت بین الاقوامی اور شہری و صنعتی کلچر کی نمایندہ ہے۔ اس سے توقع رکھنا کہ وہ یہاں کی علاقائی ثقافتوں سے ہم آہنگ ہو جائے بے جا ہے۔

اصل سوال اس وقت یہ ہے کہ کراچی یا سندھ میں آباد اردو بولنے والی نسلیں مہاجر ہیں بھی یا نہیں؟۔ یقیناً نہیں ہیں۔ لفظ مہاجر تو بس زیب داستاں کے لیے ہے یا پھر بااثر طبقہ اپنے مفادات کو تحفظ دینے کے لیے اس لفظ سے کھیل رہا ہے۔ خود حکومت وقت بھی دانستہ لفظ "متحدہ" کے بجائے لفظ مہاجر کو دہراتی ہے اور چاہتی ہے کہ یہ لفظ مٹنے نہ پائے۔ بنیادی بات ملک کے فرزند ہونے کی حیثیت سے انسانی حقوق کی مانگ، آبادی کی شرح کا تعین کرنا اور انتخابی حلقہ بندیوں میں جو گڑبڑ کی گئی ہے اس کو صحیح کرنا ہے۔ یہ مسائل صرف مہاجروں تک محدود نہیں ہیں بلکہ چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پسنے والے ان سندھی و بلوچوں کا بھی ہے جو اپنے دولت مند اور مراعات یافتہ طبقہ کی بالشت بھر اقلیت سے کٹے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ احساس کہ اردو بولنے والی طاقتور اکثریت ان کے مسائل سے لاتعلق ہے سراسر حق بہ جانب ہے۔ سندھی و بلوچی عوام کا المیہ یہ ہے کہ ان کی قیادت کسی اور اقلیت کے ہاتھ میں ہے۔ جو صدیوں سے ان کو غلاموں کی طرح استعمال کرتے رہے ہیں۔ اس قیادت نے اگر کوئی کارنامہ انجام دیا تو یہ زبانوں، ثقافتوں اور نسلوں اور علاقوں کے شعور کو اپنی سیاست کا ہتھیار بنایا، عوام کے مابین نفرتوں اور دشمنی کے جذبات کو ہوا دی اور ان کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اب وہ مرحلہ بھی آگیا ہے جب معصوم و بے گناہ عوام کی لاشوں پر سیاست کا کھیل کھیلا جارہا ہے "آگے سمندر ہے" اپنے مخاطب عوام کو اس حقیقت کے شعور سے دور لے جاتی ہے۔ ناول نگار نے کبھی خود لکھا تھا کہ:

"معاشرتی حقیقت خود مختار نہیں ہے وہ بہت سی غائب اور حاضر حقیقتوں گم شدہ اور نوآمدہ عوامل کے گھال میل سے جنم لیتی ہے" (ماہانہ معیار دہلی ۱۹۷۰ء)

سماج کے بارے میں یہ زاویہ نظر معقول ہے مگر ناول اس کی تردید کرتی ہے۔

انتظار حسین کا تعلق خواہ کسی مکتبہ خیال سے ہو یا نہ ہو بہرحال ان حلقوں سے ضرور ہے جن کے لیے ترقی پسند طرز احساس مدلل اختلاف سے زیادہ ایک طرح کی گالی ہے۔ تقسیم برصغیر کے بعد غیر ترقی پسند ان حلقوں نے جو بھی ادبی سرمایہ پیش کیا ہے اس کی تصوریت و رومانیت اور تجریدیت و نری انفرادیت نے آنے والی پر بھی لکھی نسلوں کو کوئی صحیح سمت دکھانے کے بجائے ان کو گم کردہ راہ کر دیا۔ موجودہ صورت حال میں جب کہ ہمارا سماج گلنے سڑنے کے مرحلے میں پہنچ گیا ہے تو اس کی مختلف وجوہ میں ایک یہ ادبی سرمایہ بھی ہے اس کا موازنہ اب اگر غالب، سرسید، حالی اور ترقی پسند مکتبہ فکر سے کیا جائے تو فرق کا اندازہ

ہو گا بہر حال ناول نگار سے یہ توقع کرنا بھی نہیں چاہیے کہ وہ طبقاتی حوالوں سے سیاسی اور اقتصادی پس منظر کی اصل صورت پیش کرتے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بھی اتنے پے چیدہ انسانی مسئلے کو لاینحل سمجھ کر چھوڑ دیا۔

فرد پرست اور باطن مرکز ادب کی فراری سرشت جہاں ادب کو اجتماعی اور خارجی معمولات سے کاٹ دیتی ہے وہاں لکھنے والوں کو بھی ایک طرح کی بے معنی آزادی اور شخصی خود مختاری کے کامپلکس سے دوچار کرتی ہے جس کی حد بعض اوقات مطلق العنانی تک پہنچ جاتی ہے۔ نفسیات، بشریات، عمرانیات، تاریخ اور کلچر جیسے علوم کے شعبوں میں جو بڑی پیش رفت ۱۹۶۰ء کے بعد ہوئی ہے اس نے بھی ترقی پسند طرز فکر کی صحت و سند کو تقویت پہنچائی ہے۔ یہ بات اب بڑی حد تک سائنسی ہے کہ شخص ہو یا قوم ان کو خاندانی، ماحولیاتی، طبقاتی، جغرافیائی اور ثقافتی حوالوں ہی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ تحلیل نفسی کی میکانزم بھی اس حوالے سے بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ باطنی اور حسی سفر کا محرک بھی یہی حوالے ہوتے ہیں۔ مغرب میں ۱۹۶۰ء کے بعد فارملسٹوں اور شکاگو اسکول والوں کی ایک چھوٹی سی جماعت نے اس مشکل سے چھٹکارا پانے کے لیے تاریخ اور ثقافت کے علوم ہی کو لغو اور مہمل قرار دے دیا بعد میں ساختیات اور اس کی شاخوں نے گرم لوہے پر چوٹ مارتے ہوئے متن کی مکمل خود مختاری کا نعرہ بلند کیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ مصنف یا تخلیق کار اور متن کی معنویت لایعنی ہیں۔ متن اپنی صورت اختیار کر لینے کے بعد اپنے خالق سے بھی آزاد ہو جاتا ہے اور اپنے معنی سے بھی۔

۹۔ انتظار حسین اب تک برصغیر کی اس تہذیب و تاریخ کے منظر کو تک رہے ہیں جو حقیقت تھا مگر تقسیم نے اسے تاریخ کے محفوظ خانے میں منتقل کر دیا۔ وہ ایک اجتماعی شعور جسے زمانے کے ہاتھوں نے اجتماعی لاشعور کی صورت دے دی تکتے رہنے کی اسی جذباتی کیفیت نے ان کے یہاں ماضی کی طرف واپسی کا رجحان پیدا کر دیا۔ ان کے عہد میں زیادہ تر غیر ترقی پسندوں نے جو ناولیں تخلیق کیں ان میں بھی حال سے فرار اور ماضی کی طرف گریز کا احساس حاوی ہے۔ ان کے نقطۂ نظر بے معنی (IRRELEVANT) ہونے کی بنا پر اپنے اثرات مرتب نہ کر سکے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی اور محمد حسن عسکری تہذیب کے جس رخ کی پیش گوئی کرتے رہے وہ کہیں نہیں ہے۔ یہ ضرور ہوا کہ برصغیر کی مشترک تہذیب و تاریخ کو لغو قرار دے کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا مگر نئے ملک کی تہذیب و تاریخ کے سرے مسلم مشرق وسطیٰ سے جوڑ کر ایک تاریخ بنانے کی جدوجہد بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوئی اور نہ علاقائی ثقافتوں کو باہم ملا کر تہذیبی پہچان قائم کرنے کی بیل منڈھے چڑھ سکی۔ ان منتشر کاوشوں کا اصل سبب ۱۹۷۴ء کا سیاسی و تاریخی اتھل پتھل تھا جس نے غیر ترقی پسند اہل نظر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ انھوں نے تبدیلی سے ہم آہنگی پیدا کر کے صحیح سمت کی تلاش اور اس کے لیے جدوجہد کے شعور کو فروغ دینے کے بجائے ماضی کی پناہ گاہ میں سکون حاصل کیا۔ ترقی پسند اہل نظر نے عصری حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ نئی حقیقتوں کا تعین کیا اور جہد و احتجاج کے شعور کو فروغ دیا۔ ماضی کی روایات اور تاریخ و ثقافت جیسے موضوعات کا تصوراتی برتاؤ (IDEALISATION) اور ان کو ایک فکری جہت دینے کا کارنامہ قرۃ العین حیدر نے بھی ادا کیا۔ اس موضوع پر بعد میں جو ناول اور افسانے لکھے گئے ان پر قرۃ العین کی چھاپ نظر آتی ہے "بستی" اور "آگے سمندر ہے" میں بھی کسی نہ کسی زوایئے سے یہ رنگ و آہنگ ابھرتا ہے۔ انتظار حسین بلاشبہ فنی و تخلیقی حوالوں سے اعلیٰ مرتبے کے ناول نگار ہی کہے جائیں گے۔ انھوں نے اپنی اسلوبیاتی اور تاریخی انفرادیت کا بھی اظہار کیا ہے۔ ان کی قصہ گوئی کا ماخذ وہ عام کہانیاں ہیں جو انھوں نے اپنے بچپن میں بزرگوں سے سنی تھیں۔ کسی بھی تخلیق کار کا انداز نظر جزوی یا کلی طور پر غلط ہو سکتا ہے۔ دلائل کے ساتھ اس غلطی کی نشاندہی کرنے میں کوئی ہرج بھی نہیں مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیے کہ تخلیق کار کی فنی و تخلیقی صنعت گری (CRAFT) اگر وہ اعلیٰ معیار رکھتی ہو ، انداز نظر کی خاطر قربان کر دی جائے پھر "آگے

سمندر ہے "میں ایسے بھی اجزا ملتے ہیں جن کی معنویت اور سمت روشنی و رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ ان کا یہ نقطہ نظر بھی کہ مستقبل کا سورج روایت ہی کی کوکھ سے ابھرتا ہے اور بعض روایتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان سے لاتعلقی یا ان کا خاتمہ ہمیں صرف ماضی ہی سے کاٹ نہیں دیتا بلکہ حال کو ویران اور مستقبل کو بے بنیاد کر دیتا ہے اپنی جگہ سائنس ہے تاریخ اور تخلیقی متن کے سماجی رشتوں سے فارملسٹوں اور ساختیاتیوں کی طرح انھوں نے کبھی انکار نہیں کیا۔ جن دنوں امریکہ میں فارملسٹوں اور شکاگو اسکول والوں نے تاریخ کے مردے کو اپنے خیال میں دفنا دیا تھا (جے۔ ایچ۔ پلمب (J-H PULMB) دی ڈیتھ آف دی پاسٹ بوسٹن ۱۹۷۰ء) روشن خیال ریڈیکل اور ترقی پسند دانشوروں کے حلقے ادب و تاریخ کے لازم و ملزوم تعلق کے دفاع میں سرگرم عمل تھے۔ امریکن ہسٹاریکل سوسائٹی نے دسمبر ۱۹۶۹ء میں اس موضوع پر کنونشن کا اہتمام کیا تھا۔ اس موضوع پر مباحث کو سی وان وڈورڈ (C. VANN WOODWARD) نے اپنی کتاب "فیوچر آف دی پاسٹ میں سمیٹا ہے (مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۸۹ء) استعار حسین کا یہاں بھی تاریخی شعور تخلیقی دھارے کی سطح پر حرکت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے مثلاً جب وہ تاریخ اندلس کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ:

"کھجور کا پیڑ مسئلہ ام رقیبہ کا تھا۔ میرا نہیں ویسے یار عبدالرحمٰن اوّل نے کھجور کا پیڑ بو کر اچھا نہیں کیا طارق بن زیاد کے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا واپسی کا رستہ پھر سے کھول دیا۔ ہر کھجور ایک سرنگ تھی کہ اس میں اترو اور اپنے صحرا میں جا نکلو"

"جواد میاں یہ آج کی بات نہیں ہے۔ مسلمانوں نے کبھی اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا جب بہت دل دکھتا ہے تو اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ مرزا دلاور بیگ کی شکایت کرتے ہو۔ سوچو کہ تمھاری تاریخ میں کیا ہوتا رہا ہے۔ سچی بات یہ ہے جواد میاں ہم اپنی تاریخ کے ڈسے ہوئے ہیں۔ کسی سے نہیں ڈرتے ہیں بس اپنی تاریخ سے ڈرتے ہیں..... جواد میاں عبرت اگر کوئی حاصل کرے تو میں کہتا ہوں اندلسی بہت بد نصیب تھے کیا عمارت کھڑی کی اور اپنے ہی ہاتھوں سے اسے ڈھا دیا۔"

اہل نظر بشرطیکہ جنوئین ہو تاریخی شعور کی تشکیل ماضی و حال کے درمیان ٹکراؤ کی تحلیل کے ذریعہ کرتا ہے تاکہ اپنے نتائج میں وہ روایت کے ان اجزا کو پا سکے جو عصری تقاضوں کے ساتھ گھل مل جانے کی سکت رکھتے ہوں۔ "آگے سمندر ہے" میں تاریخی شعور کی تشکیل کے یہ آثار ہمیں محمو بھائی کے کردار میں نظر آتے ہیں۔ یہ بہت فعال اور جامع کردار ہے۔ اپنی وضع قطع معمولات، مجلسی زندگی سے دلچسپی لینے والا۔ ذوق شعری سے مالا مال اور اپنے ماضی کی جملہ روایات میں ڈھلا ہوا کردار زاویہ نظر کے اعتبار سے اپنے عہد میں سانس لے رہا ہے۔ اپنے چبھتے ہوئے طنزیہ فقروں کے ذریعے حقیقت حال کی نشاندہی کرتا ہے وہ چلتے پھرتے سوتے ہوئے لوگوں کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔

"اب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ وہاں کیا تم اندلس کی تاریخ پڑھانے گئے تھے مگر اندلس کی تاریخ سے تم نے نچوڑ کر نکالا کیا۔ ایک کالی بلی اور کھجور کا پیڑ۔ ویسے مجھے تاریخ پر بات کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے مگر میں کہتا ہوں تاریخ پر بات کرنی ہے تو ایسے کرو جیسے تاریخ پر بات کی جاتی ہے۔"

"اماں باؤلے ہوئے ہو۔ سمندر کے کنارے بسے ہوئے شہر کی کہیں جڑیں ہوا کرتی ہیں۔ وہ تو پانی پہ تیرتا ہے"

"محمو بھائی نے خاموشی سے مجھے سنا۔ غور سے مجھے دیکھتے رہے پھر بہت متانت سے بولے میاں جواد تمھیں ایک مشورہ دوں۔"

"ضرور دیجیے"

"سوچنا چھوڑ دو یا پھر اس شہر کو چھوڑ دو۔"

"کان دھر کر سنو جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے امر واقعہ سناتا ہوں۔ جواد میاں یہ شہر بہت خصی ہے۔ سندھی، پنجابی، بلوچ، پٹھان، مہاجر..... رُکے اور پھر بولے... اور مہاجر کی کوئی ایک قسم تھوڑی ہے۔ کوئی پورب کا کوئی پچھم کا کوئی اتر سے آیا۔ کوئی دکن سے چلا۔ امروہے والے سمجھتے ہیں کہ کراچی دوسرا امروہہ ہے۔ جیسے جو بھی مہاجر ہے امروہوی ہے اور جو بھی امروہوی ہے اپنے امروہے پن میں مگن ہے۔ اپنے مرزا ہادی علی بدایونی اچھے بزرگ ہیں مگر ہیں تو بدایونی۔ کبھی مجھے لگتا ہے جو بھی مہاجر ہے وہ بدایونی والا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ یوپی کے وہ قصبے بھی جو یوپی میں گمنام تھے کراچی میں آکر....."

"اچھا کبھی تم نے ڈبائی کا اپنے ہوش میں نام سنا ہے۔ (محبو بھائی)

"ڈبائی کون سی جگہ تھی؟" (جواد)

"ارے کسی ڈبائی والے کے سامنے ایسی بات نہ کرنا قیامت آجائے گی۔ علی گڑھ کے پچھواڑے ایک مناسا قصبہ ہے۔ وہاں تو خیر اپنی حدوں میں تھے یہاں میں ان لوگوں سے ملا تو اُن کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ کہتے تھے کہ سرسیّد احمد خاں نے غلط جگہ کا انتخاب کیا۔ علی گڑھ کالج کو ڈبائی میں بننا چاہیے تھا۔" (محبو بھائی)

"میں ایک موضوع پر تحقیق کر رہا ہوں "شاعری اور ہجرت" کیسا عنوان ہے (رفیق) جن کا تعلق پنجاب سے ہے۔ خوب ہے۔ آگے چلو (محبو بھائی کہتے ہیں)

"اب مجھے دو ایسے مہاجروں کی تلاش ہے جو اہلِ زبان ہوں گے مگر شاعر نہ ہوں۔

"اماں باوَلے ہوئے ہو۔ ناممکنات کو ممکن ثابت کرنے پر تلے لگتے ہو۔"

"مگر توصیف میاں۔ خدا کا خوف کرو یہ مشاعروں اور کباب پراٹھوں کا زمانہ ہے۔ شہر میں قیامت ٹوٹی ہوئی ہے اور تمھیں عیاشیاں سوجھی ہیں۔ (محبو بھائی)

"ویسے تقریب اس کی کیا ہے۔" (رفیق)

ہمارے علاقے میں آج کرفیو اٹھا ہے۔ بس اس خوشی میں (توصیف)

"اماں یہ تو عارضی خوشی ہے۔ حالات کا کوئی اعتبار ہے۔" (محبو بھائی)

"کل کی کل دیکھی جائے گی۔ آج تو کرفیو نہیں ہے، نا" (توصیف)

"سبحان اللہ۔ کیا فلسفہ ہے۔" (محبو بھائی)

"وہی بات کہو گے، کہ ویسے نظر نہیں آتے۔ یار باتوں کو دہرایا مت کرو اس سے مجھے لگتا ہے کہ تم واقعی بوڑھے ہو گئے ہو۔" (محبو بھائی)

شاید دلہرا ہی رہا ہوں۔ (جواد)

محبو بھائی ہنسے۔ استاد یہ تو پورے کے پورے گم ہو گئے ہیں ان کی تو کایا پلٹ ہو چکی ہے۔ اب یہ نخالص کراچی والے ہیں۔ (محبو بھائی)

اور یہ جو ہمارا لکھنؤ ہماری دلی کرتے رہتے ہیں۔ (جواد)

سب فراڈ۔ مگر خیر انھیں معاف کر دو یہ فراڈان کی مجبوری ہے۔ کراچی میں رہنے کے لیے آدمی کو کوئی نہ کوئی فراڈ کرنا پڑتا ہے۔" (محبو بھائی)

ہم باہر نکلتے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دروازے پر پجارو کھڑی ہے اندر کلاشنکوف بردار رضاکار بیٹھے ہیں۔ (جواد)

محبو بھائی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ یہ کیا چکر ہے۔
خاموش۔ محبو بھائی ۔نے آہستہ سے کہا۔ یہ غازی صاحب کا محافظ دستہ ہے۔"
"یہ کہتے کہتے محبو بھائی کھڑے ہو گئے۔ جا کر دیکھتا ہوں کہ حالات کیا ہیں۔
آپ کے جانے سے حالات میں کوئی فرق پڑ جائے گا۔ (جواد)
فرق تو نہیں پڑے گا مگر آدمی کو حالات سے باخبر تو رہنا چاہیے۔ کم از کم بے خبری میں تو نہ مارے جائیں"
"بچنے کا معاملہ تو جواد میاں یہ ہے کہ قسمت والا ہی بچے گا اور اپنی کوشش اور احتیاط سے نہیں بچے گا۔ جو مر رہے ہیں الل ٹپ مر رہے ہیں اور یار مرنے جینے کی ویسے بھی کوئی منطق ہوتی ہے اور ہم لوگ تو یونہی ایک مہمل زندگی گزار رہے ہیں۔" (محبو بھائی)

"استاد جہاں سے تم بھاگ کھڑے ہوئے وہیں سے تو اس سفر کو معنی ملنے شروع ہوئے تھے۔ (محبو بھائی)
"پیارے ایسا مت کہو۔ یہ شہر بے فیض اب ہوا ہے اُس وقت ہوتا تو جھگی ہی میں پڑے گلے سڑتے رہتے"
"میاں تمھاری بھی ایک مجبوری ہے۔ محبو بھائی بولے اور وہ یہ ہے کہ تم اس وقت اس کوچے سے سلامت نکل سکتے غزل یا گولی۔ انتخاب تمھارے ہاتھ میں ہے"

۱۱۔ مضبوط اور فعال کردار کی بنیادی خوبی یہی ہے کہ اصل و نقل میں کوئی تمیز باقی نہ رہے۔ ایسا محسوس ہو جیسے وہ ہے۔ ہم اوروں سے ملتے ہیں باتیں کرتے ہیں اسے دیکھتے ہیں۔ انتظار حسین نے ایک ایسا ہی کردار محبو بھائی تخلیق کیا ہے جو دیکھنے میں تو لا ابالی سا ہے مگر اس کے اندر بہت بڑا انسان چھپا بیٹھا ہے۔ وہ سب کا دوست ہے جواد کا بھی جو اس کے بارے میں وفاداری بشرطِ استواری کا کوئی تاثر قائم نہیں کر سکا تاہم جب گولی لگنے۔ ہسپتال میں آپریشن سے فارغ ہونے اور گھر واپس آجانے کے بعد۔ جب جواد کو انھوں نے تفصیلات بتائیں کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی اور کہا:

"اور پتہ ہے میں کیا سوچ رہا تھا"
"کیا"
یہی کہ یار میں اکیلا رہ جاؤں گا
اکیلے میں مسکرایا۔ محبو بھائی آپ کے دوستوں واقف کاروں فدائیوں کی تو قطاریں لگی ہوئی ہیں"
ہاں وہ بھی ہیں مگر یار..... تم نہیں سمجھ سکتے اس بات کو۔

۱۲۔ جواد جب ہجرت کر کے کراچی پہنچا تو اس کی پہلی جان پہچان کافی ہاؤس میں محبو بھائی سے ہوئی تھی۔ انھوں نے ہی اسے اپنی جھونپڑی میں سر چھپانے کی جگہ دی تھی۔ جھونپڑی سے کرائے گھر اور پھر فلیٹ تک دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے گولی کا نشانہ جواد بنا تو محبو بھائی نے اسے بچانے تیمارداری کرنے اور حوصلہ بڑھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر آج میں اس کا یہ ساتھی گولی کا نشانہ بن گیا اور جواد کے پہنچنے سے پہلے ہی دنیا سے گزر گیا۔ اسی نے جواد کو ہندوستان بھیجا تھا تاکہ اپنے خونی رشتوں سے مل آئے جہاں بچپن کی ساتھی میمونہ سے ملاقات ہو گئی۔ شادی کی تجویز بھی ہوئی دونوں ہی راضی تھے مگر اس سے پہلے کہ کسی فیصلے کا اعلان ہوتا وہ ہندوستان سے واپس کراچی آگئے اور محبو بھائی نے کیا خدا لگتی بات کہی تھی۔

"انھوں نے شاید کچھ بھانپ لیا تھا۔ انھوں نے ٹوہا اور میں کھلتا چلا گیا۔
گویا جب جمنے کا وقت آیا تو تم اکھڑ لیے"

۱۳۔ اپنی سرزمین سے اکھڑنا اور اجنبی سرزمین پر قدم جمانا اس صدی کا ایک اہم مسئلہ بھی ہے اور صرف کسی ایک علاقے تک محدود نہیں ہے بلکہ اب تو بین الاقوامی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ہندوستان کے شہر ویاس پور پہنچنے کے بعد بڑی بوڑھیوں کے تند و تیز فقروں نے جواد کو بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

"پچھلے برس آیا تھا کہنے لگا بڑی بھابھی آپ نے ایسی بد دعا دی کہ میں ابھی تک بے ٹھکانہ ہوں۔ میں نے کہا بھیا بد دعا میں نے تمھیں نہیں دی تمھاری زمین نے تمھیں بد دعا دی۔ پیارے میاں زمین بھی کوستی ہے"

"بات یہ ہے میمونہ پاکستان میں بیٹے اپنے باپوں کے ساتھ وہی کر رہے ہیں جو ان کے باپوں نے اپنے باپوں کے ساتھ کیا۔

"انھوں نے اپنے باپوں سے منہ موڑ کر پاکستان کی راہ پکڑی تھی اب ان کے بیٹے انھیں ان کے حال پر چھوڑ کر امریکہ کی طرف بھاگ رہے ہیں۔"

ہندوستان میں جواد کی ملاقات خیرل بھائی سے بھی ہوئی جو اپنے زمانے میں تحریک پاکستان کے سرگرم رکن تھے مگر اب وہ اتنا بدل چکے تھے کہ کچھ اور ہو کر رہ گئے تھے جواد نے جب انھیں چھیڑا۔

"آپ کا کبھی جی نہیں چاہا کہ پاکستان کا ایک پھیرا لگائیں۔

میرا۔ انھوں نے گھور کر دیکھا۔ نہیں

آخر خیرل بھائی آپ پاکستان سے بے تعلق تو نہیں تھے۔ تحریک میں تو آپ پیش پیش تھے۔"

ہاں مگر اس وقت وہ کوئی ملک نہیں تھا ایک خواب تھا خواب جب تک خواب رہے اس میں بہت سحر ہوتا ہے۔

۱۴۔ "آگے سمندر ہے" میں انتظار حسین نے ماضی و حال پر محیط بڑی زندہ اور سچی کہانی بنی ہے مگر بے نتیجہ و بے انجام جو پڑھنے والوں کو ناآسودگی کے موڑ پر چھوڑ کر تمام ہو جاتی ہے۔ ناول کے آخر میں ایک طرح کا احساس بے بیتی ابھرتا ہے اس میں ایک قسم کی تجریدیت بھی ہے اور رومانیت بھی ناول کا سفر یادوں سے شروع ہو کر یادوں ہی پر ختم ہو جاتا ہے کیونکہ مجو بھائی کا کردار جو تاریخی صورت حال کو معنی اور سمت دے سکتا تھا آخر میں دنگے فساد کے دوران آنے والی ایک گولی سے ہلاک ہو جاتا ہے۔


# غالب آشفتہ نوا

از

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں

قیمت: =/۵۰ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی

1993 - 94
کے لیئے شرح منافع
2.35 روپے
فی یونٹ

# سرمایہ کاری اور بیمۂ زندگی کی بات جب ہوں این آئی ٹی اور اسٹیٹ لائف ساتھ ساتھ

نئی لائف اسکیم کے تحت بیمۂ زندگی اب منافع بخش سرمایہ کاری۔ این آئی ٹی اور اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن نے اپنے صارفین کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک نادر موقع فراہم کیا ہے جس کے تحت این آئی ٹی میں سرمایہ کاری کے ساتھ ساتھ بیمۂ زندگی کا دوہرا فائدہ حاصل کریں۔

صرف پہلا پریمیم ادا کرنے پر این آئی ٹی آپ کو ۲۱ سالہ انشورنس پالیسی مہیا کرے گا جبکہ این آئی ٹی یونٹ پر حاصل ہونے والے منافع سے بقیہ تمام پریمیم بھی ادا کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ آپ کے یونٹس پر منافع بھی جمع ہوتا رہے گا۔

موجودہ یونٹ خریدار بھی اس اسکیم سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے این آئی ٹی کے کسی بھی دفتر سے رجوع کریں۔

NAI LIFE
INSURANCE LINKED UNITS

صدر دفتر: نیشنل بینک آف پاکستان بلڈنگ (پہلی منزل) آئی آئی چندریگر روڈ، پوسٹ بکس نمبر ۵۶۷۱ کراچی
فون: ۵۹-۵۶-۲۴۱۲۰ ٹیلیکس: ۲۱۳۷۶ این آئی ٹی پی کے فیکس: ۲۴۳۰۶۲۳

NIT
نیشنل انویسٹمنٹ ٹرسٹ لمیٹڈ

PID Islamabad 94/2

Prestige

قومی زبان (۴۹) نومبر ۱۹۹۵ء

# ضیاء الدّین پروانہ

پروفیسر شفقت رضوی

بارہویں صدی ہجری کے دوران ولی اور سراج کے زیر اثر دکن میں اردو شاعری نے بے حد فروغ پایا اور لاتعداد صاحبِ دیوان شعرا منظر عام پر آئے۔ ناقدریٔ زمانہ نے انھیں فراموش کر دیا۔ ان میں سے اکثر کے بارے میں تحقیقی کام ہوا ہے اور نہ وہ تاریخ ادب کا حصّہ بن سکے ہیں۔ انھیں میں ایک زود گو شاعر پروانہ بھی ہیں۔

ان کا نام ضیاء الدّین حسنی اور پروانہ تخلص، تولد کے اعتبار سے برہانپور سے تعلق تھا۔ عام تذکرہ نگاروں بلکہ معاصر تذکرہ نگاروں نے بھی یا تو ان سے اغماض برتا ہے یا اختصار سے کوائف تحریر کیے ہیں ان کے والد کا کہیں ذکر ملتا ہے اور نہ خاندانی حالات کا...! اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی اور لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی ان کے ہم عصر بھی تھے، اور شخصی تعلق و ارتباط بھی رکھتے تھے اس کے باوجود انھوں نے صرف چند جملوں پر اکتفا کیا ہے۔ تمنا اورنگ آبادی نے لکھا ہے کہ

"در ہنگامہ آرائی ممتاز و یگانہ، ضیاء الدّین پروانہ۔ پروانۂ شمع محفل۔ استعداد نظرتش از شعلہ توجہ سید سراج الدّین سراج فروغ، خوش لہجگی درزید و فتیلۂ فکرش از مشعل افروزی آں زینت بخشِ انجمن، فطرت چرب زبانی گزندہ روشنی ماند و بودش از معمورہ برہانپور است"

(تذکرہ گل عجائب: ص ۱۳)

شفیق اورنگ آبادی نے تو اختصار کی حد کر دی اور ایک جملہ پر اکتفا کیا ہے۔

"مرید و تلمیذ شاہ سراج است۔ فکرِ سخن ریختہ می کند و تا حالت تحریر در احمد نگر می گزرانید" (تذکرہ چمنستان شعراء: ص ۶۱)

سراج الدّین علی خاں آرزو کا بیان ہے کہ

"پروانۂ چراغ سخن و عندلیب ہزار داستان این چمن سر رشتہ ارادتش بخدمت شاہ سراج الدّین اورنگ آبادی است و تلمیذ میر صاحب قبلہ" (مجمع النفائس (قلمی) ورق ۷۹ الف)

بعد کے تذکرہ نگاروں میں عبدالجبار خاں ملکاپوری نے قدرے تفصیل سے کام لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

"پروانہ تخلص شاہ ضیاء الدّین نام آپ کا مسقط الراس دارالسرور برہانپور ہے آپ کے بزرگانِ سلف اورنگ آباد آئے اور سکونت پذیر ہوئے۔ آپ بھی بزرگانِ سلف کے ساتھ ایام طفلگی میں آئے اور اسی شہر میں نشو و نما پایا اور سنِ شعور کو پہنچ کے تکمیل کتب درسیہ متداولہ اساتذہ کرام سے

کیں اور شعر و شاعری میں حضرت آزاد بلگرامی سے اصلاح لیتے رہے۔ آزاد کی اصلاح سے درجہ کمال کو پہنچے چنانچہ میر صاحب کی خدمت میں اپنی نیازمندی کا ذکر کرتے ہیں:

بہ پیشت اے نسیم صبح عرض مطلبی دارم

رسائی حضرت آزاد را از من زمیں بوسی

پروانہ صوفی منش و فقیر دوست تھا شاہ سراج الدین اورنگ آبادی کا مرید خاص و خلیفہ تھا تا بہ زندگی پیر اورنگ آباد میں قیام پذیر رہا پیر کی رحلت کے بعد سیر و سیاحت کا عزم کیا۔ پیر و مرشد کی قبر اور مکان کی عمدہ تعمیر کی۔ تعمیر کے بعد بیدر گیا وہاں اپنے لیے ایک تکیہ تعمیر کیا وہاں کے حکام و اعزہ آپ کی تعظیم و تکریم کرتے تھے "گل رعنا" کا مولف لکھتا ہے کہ "ایک زمانہ" میں ہم دوستان موافق یعنی میر اولاد محمد ذکا و میر عبدالقادر مہربان و میرزا عطا ضیا و شاہ پروانہ ترحمہ وغیرہم کا مجموعہ ہوتا تھا باہم حسن محبت و اخلاق سے لطف و حظ حاصل ہوتا تھا شعر و شاعری کا مذاکرہ و مباحثہ رہتا تھا" پروانہ صاحب ہندی و فارسی دونوں زبانوں میں کلام موزوں کرتا تھا لیکن شعر گوئی ہندی کی طرف زیادہ مایل تھا۔ کبھی کبھی اعزہ و احباب کی خواہش پر فارسی بھی موزوں کرتا تھا۔ دونوں زبانوں میں آپ کا کلام رنگیں و خوش ادا ہے آپ ۱۱۷۵ ہجری میں احمد نگر رونق افروز تھے متقضائے آب و خورش مدت تک وہاں سکونت پذیر رہے اس سکونت کی وجہ سے بعض نے آپ کو احمد نگری بعض نے بیدری لکھا ہے۔ واقعہ میں آپ مولد برہانپوری، نشو و نما کی وجہ سے اورنگ آبادی تھے کسی تذکرہ نویس نے آپ کا سنہ وفات نہیں لکھا لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۹۰ھ میں رحلت کی"

(محبوب الزمن: ص ۱۶-۳۱۵)

پروانہ کی ایک تالیف "انوار السراج ہے جس کا واحد قلمی نسخہ محبی تحسین سروری کی ملک تھا۔ اس کا عکسی نقل ہمارے پاس محفوظ ہے۔ "انوار السراج" دراصل شاہ سراج کے احوال میں ہے ضمناً پروانہ نے بھی اپنے حالات درج کیے۔ وہ اپنا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"فقیر حقیر ضیاء الدین الحسنی المتخلص پروانہ الحنفی مذہباً والجیشی طریقتہً الصوفی مشرباً و برہانپور مولداً و منشاً و اورنگ آباد وطناً" (انوار السراج (قلمی) ورق اب)

اس میں انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش بھی درج کی ہے لکھتے ہیں۔

"این بے بضاعت قلیل الاستطاعت بست و ششم رجب روز دوشنبہ در سنہ خمس و اربعین و مایہ والف لباس ہستی پوشید" (ایضاً ورق ۵ ب)

ان کی خود نوشت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۲۶ رجب ۱۱۴۵ھ بروز پیر پیدا ہوئے گویا سراج اورنگ آبادی سے عمر میں تقریباً ۲۰ سال چھوٹے تھے۔ قلی خاں صاحب تذکرہ نشتر عشق نے انھیں سادات رضویہ میں بتلایا ہے اس کی توثیق پروانہ کی تحریر سے نہیں ہوتی۔ انھوں نے اس خود نوشت میں آبا و اجداد کے نام اور کوائف نہیں لکھے۔ البتہ ان کی تحریر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بزرگ برہانپور سے ترک سکونت کر کے اورنگ آباد آ گئے تھے لیکن یہ واقعہ کب وقوع پذیر ہوا اس کی بھی صراحت نہیں ملتی۔

ایسے شواہد ضرور ملتے ہیں۔ کہ ۶۱ - ۱۱۶۰ھ میں برہانپور میں تھے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ اورنگ آباد منتقل ہو جانے کے باوجود ان کا برہانپور آنے جانے کا سلسلہ رہا۔

پروانہ نے ۱۱۵۷ھ میں مشقِ سخن کا آغاز کیا ابتداء میں سراج کے شاگرد میر مہدی المتین سے اصلاح لی۔ جو مستقلاً برہانپور میں مقیم رہے۔ ان کی تعلیم کی تکمیل اورنگ آباد میں ہوئی جن نابغۂ روزگار ہستیوں سے انھوں نے فیض پایا ان میں سراج کے علاوہ علامہ آزاد بلگرامی اور حضرت سیّد فخر الدّین اورنگ آبادی بھی شامل تھے۔ اپنے استاد متین کے وسیلہ سے وہ سراج کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ سراج سے اپنے تعلق کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ

"درہمایا ے سعادت انجام مطابق ۱۱۶۱ھ احدی و ستین و مایہ والف آستاں بوسی جناب مقدس انتساب، شمع محفلِ اولیاء حضرت سراج الاتقیاء پیشانیِ بخت افروخت و شرف بیعت ولا سرمایہ دولت نشاتین اندوخت و قریب پانزدہ، وسال در حضورِ پر نور آں آفتابِ مشرق ہدایت و عرفاں، رہنمائے اہل عشق و وجدان تربیت ظاہر و باطن یافت" (ایضاً ورق ۶ الف)

سراج نے ۶۱/۱۱۶۰ھ میں برہانپور کا سفر کیا تھا امکان یہی ہے کہ وہیں پروانہ ان کے مرید ہوئے ہوں گے۔ اورنگ آباد آکر ان سے فیوضِ روحانی کا سلسلہ جاری رکھا اور علوم ظاہری کے لیے حضرت غلام آزاد بلگرامی سے رجوع کیا۔ اس بارے میں ان کا بیان ہے کہ

"دلِ وحشت راکہ خوگرِ صحبت ارباب کمال بود، وسیلہ اطمینان ناگزیر افتاد، طبیبے کہ معالجہ امراض تواند کرد در کار شد۔ خود را بعالی خدمت ندوۂ فضلاء دہر زبدۂ کملاء عصر وحید زمان، فرید جہاں، امام آیمہ المتقدمیں، مقدمتہ الجیشِ متاخرین، حسان ہندوستان، سحبان ابن کشور جنت نشان علامۂ فنون عرب و عجم فہامۂ افتخار لوح قلم، صاحب حسب و نسب گرامی، سیّدی سندی میر غلام علی آزاد الحسینی الواسطی البلگرامی دام اللہ ظلالہ، وخلد افضالہ، رساند و بدولت تلمذ سرمایہ فراواں علوم ظاہر حاصل کرد" (ایضاً: ورق ۷ الف و ۷ ب)

اس حوالہ سے دوسری شہادت پروانہ کا وہ قصیدہ ہے جو ان کے دیوان دوم (قلمی) مخزونہ ادارہ ادبیات اردو (حیدر آباد دکن) زیر نشاں ۶۸۹ میں درج ہے۔

"التفات بمدح سیّدنا و مولانا و استادنا سیّد غلام علی المتخلص بہ آزاد مدظلہ العالی"

میرے استادِ ظاہر سیّد آزاد برحق ہیں
ہیں قرآنِ سیادت، ان سی کی میں نے سبق خوانی

علوم ظاہری میں ان سے کیا میں نے سبق حاصل
خصوصاً فارسی کے فن کی سیکھا ہوں زباں دانی

زباں میرے قلم کی اب ثنا میں ان کے قاصر ہے
کرس تعریف ان کی موسیٰ و ہارونِ عمرانی

اس زمانہ میں پروانہ حضرت فخر الدین اورنگ آبادی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے جو اس دور کے جید عالم ہونے کے سوا ممتاز روحانی پیشوا بھی تھے ان سے فیض پانے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"مولج البحرین شریعت و طریقت، واقفِ رموزِ معنوی، ذاتِ اسرار نبوی، مراۃ تجلیاتِ ربانی، شعشعہ انوارِ سبحانی، نگہت حسن خلقش معطرے زدماغِ جہانیاں و فقراہ سر رشتہ تواضعش کمند انداز دلہائے زمانیاں، سید الفقرا والمساکین حضرت سید فخر الدین مدظلہ العالی۔ الحمد للہ کہ بدستیاری توفیق گلہا از ریاض محفل عالی چنیدم و خوشہا از مزرعہ والا برداشتم و باخواجہ مقدس سراہ العزیز این ہر دو برگزیدہ انفس آفاق را بمرتبہ اتم بود و اختلاط و اتحاد شیر و شکر جلوہ می نمود"

(ایضاً: ورق ۷ ب، ۸ الف)

ان تفصیلی بیانات کی روشنی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ پروانہ حضرت سراج کے مرید حضرت آزاد کے شاگرد، حضرت سید فخر الدین کی صحبت کے فیض یاب تھے۔ ان باکمالوں نے انھیں جامع علوم ظاہری و باطنی بنا دیا تھا۔

شاعری میں تلمذ کے حوالے سے بعض تذکرہ نگاروں نے سراج کا شاگرد لکھا ہے۔ شفیق اورنگ آبادی نے "مرید و تلمیذ شاہ سراج" بتلایا ہے۔ تمنا کے بیان "پروانہ شمع محفل، استعداد" نظرتش از شعلہ توجہ سید سراج فروغ" سے بھی ایسی ہی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ عبدالجبار ملکاپوری انھیں شاعری میں بھی حضرات آزاد بلگرامی کا شاگرد قرار دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پروانہ کو مہدی المتین سے صرف تلمذ حاصل تھا۔ متین کا تعلق بھی بہانپور سے تھا۔ ان کے والد محمد امین بادشاہی منصب داروں کے زمرے میں شامل تھے وہ صاحبِ علم، اور سخن فہم تھے شعر گوئی سے شغف رکھتے تھے۔ شفیق نے ان کی تعریف میں لکھا ہے۔

"متین، ہم طالب علم، جید و خلیق و کم سخن و خوش فکر و متلاشی مضامین رنگین است"

(چمنستان شعراء ص ۲۹۴)

وہ سراج اورنگ آبادی سے تلمذ رکھتے تھے۔ پروانہ نے ان کے شاگرد ہونے کے بارے میں لکھا ہے کہ

"ازانکشاف صبح شعور کہ سنہ سبع و خمسین و مایہ و الف (۱۱۵۷ھ) پیش خدمت موجبت سید عالی نسب، سرور والا منسب در فن ریختہ استاد است کرد۔ خواجہ عالی نژاد سرخوش نشاء تند شعوری میر مہدی متین النیشاپوری والبرہانپوری بقدر مساعدتِ وقت شعر ریختہ مشق کردو"

(انوار السراج: ورق ۵ ب، ۶ الف)

اس بیان کی تائید ایک مخمس کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

"ریختہ اوستاد مصنف اعنی میر محمد مہدی المتخلص متین برہانپوری مخمس کردہ"

پروانہ نے ۱۲ برس کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا تھا چند برسوں میں اتنی مشق بہم پہنچائی کہ اورنگ آباد اور اس کے نواح کی محفلوں کی جان بن گئے وہ ۱۱۶۱ھ میں سراج کے مرید ہوئے اس وقت ان کی عمر ۱۶ سال تھی اور وہی سال ہے کہ سراج نے غزل گوئی ترک کی تارک الدنیا ہو کر منصب فقر الفخری سے ممتاز ہوئے تھے۔

پروانہ کے ذریعۂ معاش کا حال کسی ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکا۔ چونکہ ان کا قیام کسی ایک جگہ نہیں رہا اس لیے ملازمت پیشہ ہونے کا احتمال کم ہے قیاس ہے کہ وہ تجارت پیشہ تھے اور سراج کے مریدوں میں وہی مشمول بھی تھے۔ ان کے برہانپور، اورنگ آباد، بیدر، احمد نگر اور دیگر شہروں میں رہنے کے شواہد موجود ہیں۔ عبدالجبار ملکاپوری نے بتلایا ہے کہ ۱۱۷۵ھ میں وہ احمد

نگر میں تھے شفیق نے لکھا ہے کہ چمنستان شعراء کی تکمیل (۱۱۸۵ھ) کے وقت وہ احمد نگر میں تھے سراج کے نام ان کے جو خطوط کلیات مرتبہ پروفیسر سروری میں شامل ہیں بیدر سے لکھے گئے تھے۔

تصوف کی جانب رجحان رکھنے کے باوجود وہ ازحد زندہ دل اور یار باش تھے۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ ملکا پوری نے "گلِ رعنا" کے حوالے سے شفیق کا بیان نقل کیا ہے کہ "ایک زمانہ تھا کہ ہم دوستانِ موافق یعنی میر اولاد محمد ذکا، میر عبدالقادر مہربان اور میر رضا عطا ضیا اور پروانہ کا مجمع ہوتا تھا باہم حسنِ محبت و اخلاق سے لطف و حظ حاصل ہوتا تھا۔ شعر و شاعری کا مذاکرہ اور مباحثہ رہتا تھا" ڈاکٹر زور نے ادارہ ادبیات اردو میں مخطوطہ دیوان پروانہ (نشان ۵۸۶) کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک اردو قصیدے میں انھوں نے اپنے احباب کا ذکر کیا ہے جن میں ذکا، مہربان، ارشد، ساقی، متین، نثار، افتخار، امداد، سید مراد، وفا، روشن، رضا، صوفی، فتوت اللہ یار، ضیاء، محبوب، کستر، بیجان اور صاحب (شفیق) کو زمرہ احباب میں شامل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو! ص ۱۸۰)

پروانہ حضرت سراج اورنگ آبادی کے مرید خلیفہ ہونے کے ساتھ ان سے بے پناہ عقیدت ہی نہیں بلکہ محبت بھی رکھتے تھے۔ اپنے مرشد کی خاطر داری اور خدمت گزاری کے لیے ہمیشہ کمر بستہ رہتے تھے جہاں تک ممکن ہوا ان کے قدموں میں رہنے کو سعادت خیال کرتے تھے اور اگر امداد دنیاوی کی بجاآوری کے سلسلہ میں کسی دوسرے شہر کا سفر اختیار کرنا پڑتا تب بھی وہ مرشد کی طرف سے غافل نہیں رہتے تھے۔ جب سراج کا چراغِ زندگی ٹمٹما رہا تھا اس وقت پروانہ بیجاپور میں تھے وہیں سے وہ مرشد کی دلجوئی کا سامان کرتے رہے۔ انھیں باقاعدگی سے خطوط لکھتے رہے جب سراج کے خلیفہ اور جانشین شاہ چراغ نے مرشد کی جانب سے بے اعتنائی کا اظہار کیا اور احمد نگر میں اپنی پیری کی دکان سجائی اور بار بار مرشد کے اصرار کے باوجود ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوئے اس وقت پروانہ ہی سراج کا سہارا بنے وہ حسبِ مقدور مرشد کی مالی اعانت بھی کرتے تھے چنانچہ ایک موقع پر دو صد روپیہ کی ہنڈی روانہ کی تھی۔ جس کی رسید کلیات سراج مرتبہ پروفیسر سروری میں شامل ہے۔

سراج آخر عمر میں امراض متعدد مثلاً اسہال، بواسیر بادی، ضعفِ معدہ میں مبتلا رہے انھیں علاج سے چند دنوں کے لیے افاقہ ہو جاتا اور پھر امراض عود کر آتے۔ جب ان کی حالت غیر ہونے کی اطلاع پروانہ کو پہنچی وہ اورنگ آباد چلے آئے۔ مہینوں مرشد کی تیمار داری کی۔ آخرِ وقت تک اُن کے پاس رہے۔ سراج نے شاہ چراغ کو اپنا خلیفہ اور جانشین نامزد کیا تھا لیکن مرض الموت سے قبل تک باوجود اصرار شاہ چراغ ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوئے تو وہ ناراض ہو گئے اور پروانہ کو جانشین بنا دیا۔ پروانہ لکھتے ہیں کہ

> "در حدود ۱۱۷۷ھ سبع و سبعین و مایہ و الف، چہار ماہ بست و روز قبل از وصالِ مقدس کہ روز عرس شیخ آنحضرت بود خواجۂ مادر حضور، جمہور فقرا عصر و مشائخ شہر این بے استعدادِ محض را مجاز و مرخص و وصی و جانشین گردانیدند و ذرہ بے مقدار را از تحت الثریٰ بفلک الافلاک رسانیدند"
>
> (انوار السراج: ورق ۶ الف)

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ۴ شوال ۱۱۷۷ھ روز جمعہ بوقت نماز پیشیں سراج کا چراغ ہستی ہوائے نیستی سے گُل ہوا اور وہ چمن بہشت میں رونق افروز ہوئے تو پروانہ نے ان کی تجہیز و تکفین کے انتظامات کیے اور تمام خرچے کے کفیل ہوئے جنازہ چوک کی مسجد میں پہنچایا گیا جہاں شہر کے علما، صوفیا، مشائخ، عمائد نے کثیر تعداد میں نماز میں شرکت کی۔ ان کی تدفین پروانہ کے ہاتھوں ہوئی۔ بعد میں پروانہ نے زرِ کثیر صرف کر کے ایک مقبرہ اور گنبد تعمیر کروایا۔

سراج کے وصال کے بعد شاہ چراغ اورنگ آباد لوٹ آئے اور تکیہ پر قابض ہو گئے۔ پروانہ کو بے دخل کر دیا۔ یہ امر ان کی

آزردگی کا باعث ہوا۔ اس موقع پر بھی انھوں نے صلح پسندی کا مظاہرہ کیا اور مرشد کے آستان کو چھوڑ کر خاموشی سے بیدر چلے گئے۔
سراج الدین علی خان آرزو نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ

"الحال در قلعہ بدر) بیدر) تکیہ بنا کردہ باحاکم آں جا بسر میبرد" (مجمع النفاس قلمی" ورق ۷۹ الف)

سراج سے پروانہ کو جس درجہ عقیدت اور محبت تھی اس کا اندازہ اسی امر سے کیا جاسکتا ہے کہ اپنی بیسیوں غزلوں میں انھوں نے سراج کا ذکر کیا ہے۔ سراج کے وصال کے بعد پروانہ نے باقی ایام زندگی کا بڑا حصہ بیدر میں گزارا۔ عبد الجبار ملکاپوری نے اس کا سالِ وفات ۱۱۹۰ھ لکھا ہے جو اس لیے بھی درست نہیں کہ "انوار السراج" ۱۲۰۲ھ کی تصنیف ہے۔ قلی خاں نے اپنے تذکرہ نشتر عشق (قلمی) میں ان کی رحلت کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے۔

"روزے مہربا نے غلام رسول بلگرامی دریافت شد کہ شاہ پروانہ در عمر نود سالگی بتقریب ملاقات مفتی امیر حیدر بلگرامی پسرزادہ میر غلام علی آزاد کلکتہ تشریف آوردہ تا پنج سال زندگانی نمود و در سنہ ایک ہزار و دو صد و ہفتادہ فوت شد "جانِ محمد خیاط کہ یکے از مریدان شاہ پروانہ بود جسدش را براہ دریائے شور روانہ اورنگ آباد کرد" (تذکرہ نشتر عشق: جلد اول ورق ۸۹ ب)

۱۲۱۷ھ سالِ وفات قابل یقین ہے لیکن عمر کا تخمینہ درست نہیں ہے۔ ان کا سالِ پیدائش ۱۱۴۵ھ ہے اس طرح انھوں نے ۷۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان کی تدفین اورنگ آباد میں نہیں بلکہ بیدر میں ہوئی۔

پروانہ کو سراج سے تلمذ حاصل نہیں تھا لیکن ان کا بیشتر کلام انھیں کے رنگ میں ہے۔ اس بارے میں آرزو اور قلی خاں نے مناسب تبصرے کیے ہیں:

"شاہ پروانہ بہ تتبع مرشدِ خود شاہ سراج بہ شعر گوئی مشغول است" (مجمع انفائس از آرزو: ورق ۸۹ الف)

"در تلاشِ سخن پیروئی پیر خود شاہ سراج می کرد" (نشتر عشق از قلی خاں: ورق ۸۹ ب)

بارہا پروانہ نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے ان کا کلام تاحال غیر مطبوعہ ہے تذکروں میں ان کے چند اشعار بطور نمونہ ملتے ہیں۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

## تصانیفِ پروانہ:

### دیوانِ پروانہ اول:

اس کا قلمی نسخہ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے جو ناقص الطرفین ہے۔ اوراق پر نشانِ شمار موجود ہیں۔ ورق ۳۲ ب کی لوح پر بسم اللہ کے بعد غزلیات کا آغاز ہوا ہے۔ بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ یہیں سے دیوان کا آغاز ہے حالانکہ غزلیات کی ابتدا ردیف ن سے ہوئی ہے۔ اس مخطوطہ کے صرف ۱۶ ورق محفوظ ہیں:

ابتدائی اشعار:

لبوں اوپر ہیں محبوبوں کے مسی کی جمی دھڑیاں
کہ برگوں پر گلوں کی پنکھڑیاں سوسن کی آجھڑیاں
قیامت ساعتیں ہیں یا پہر یا روز یا ہفتے
مہینے سال بن کے یا قرن جگ ہجر کی گھڑیاں

احتشام خمس کے اس بند پر ہوا ہے

بات سے تیرے اگر میری شہادت ہو جائے
سرخ روئی مری دو جگ میں تو ثابت ہو جائے
شرم آوے تجھے قاتل تو قیامت ہو جائے
خوفِ جاں نیں ہے کہیں تجہ کو ندامت ہو جائے
مار کر مجہ کو مبادا تو پشیمان ہووے

اکثر غزلوں میں سراج کا ذکر ہے ان کے علاوہ "سودا" میر ذکا اور مہربان کا بھی ذکر ملتا ہے سودا کا ذکر یوں کیا ہے

جل شمع پہ پروانہ سودا کا پڑھا مصرع
عاشق کی بھی کٹتی ہے کیا خوب طرح راتیں

ذکا کی فرمائش پر چند اشعار کہنے کا حال بیان کیا ہے:

اک بار اپنے گھر سے نکل کر میں صبح کو
ملنے گیا تھا میر ذکا نامدار سے
فرمائش اس زمیں میں کی مجھ کو شعر کی
سنتے ہی میں وہ سیدِ عالی تبار سے
دو چار شعر دو ہیں کہا ہوں جلے بھنے
گر دل جلے پسند کریں اس کو پیار سے
بھیجیں دعا کے خیر کے گل میری قبر پر
اور آبِ آفریں کو لب آبدار سے

دیوان دوم موسومہ "آتش کدہ محبت"

یہ مکمل اردو دیوان ہے اس میں وہ دیوانِ اوّل کا کلام بھی شامل ہے "آتش کدہ محبت" (۱۱۸۰ھ) اس کا تاریخی نام ہے۔ اس کا مخطوطہ بھی ادارہ ادبیات میں زیر نشان ۶۸۹ محفوظ ہے۔ جو محمد صالح بیگ کا ۱۱۹۹ھ میں مکتوبہ ہے "نام و تاریخ ترتیب ردیف وار دیوان ہذا کے تحت یہ غزل ہے:

ہر شمع کو اشکِ رقت آیا
اس خاک پر ابرِ رحمت آیا
الفاظ کی کثرت، اُس میں معنی

ہو جلوۂ پاک وحدت آیا
پروانہ کی راکھ کا نمک ہے
یا شورِ دلِ قیامت آیا
دیوانِ دوم ہوا مردف
دل پیک ہوئے بشارت آیا
دیوان کا نام و سالِ تاریخ
"آتش کدہ محبت" آیا

دیوان میں ردیف وار غزلوں کے بعد سات رباعیاں، متعدد فردیات، چند مخمس ہیں۔ ایک میں مہدی المتین کی غزل کی تضمین کی دوسرے میں مراد کی غزل کی۔ ان کے بعد طویل قصائد، نعتیں اور منقبت ہیں۔ قصائد شاہ سراج، شاہ فخر الدین اور حضرت آزاد بلگرامی کی شان میں ہیں۔

دیوانِ سراج موسومہ "آتش کدہ محبت" پروانہ:۔

"آتش کدہ محبت" کے نام سے پروانہ کا مرتبہ دیوانِ سراج کتب خانہ خانقاہ عنایت الٰہی حیدر آباد میں ہے چونکہ یہ بھی ۱۱۸۰ھ میں مرتب ہوا اسی لیے اس کا بھی تاریخی نام "آتش کدہ محبت" رکھا۔ ڈاکٹر زور نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ

"کتب خانہ خانقاہ عنایت الٰہی میں پروانہ کا وہ مرتبہ دیوانِ سراج اور اس کے ساتھ خود ان کا دیوان محفوظ ہے جو ۱۱۸۰ھ میں انھوں نے یکجا کیا تھا۔ اس کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دوست ان کا (پروانہ کا) امتحان لینا چاہتے تھے کہ سراج کے کتنے اشعار ان کو یاد ہیں چنانچہ ان کے حافظہ میں سراج کا جتنا کلام محفوظ تھا اس کو انھوں نے ۱۱۸۰ھ میں ردیف وار مرتب کیا اور اس کا تاریخی نام "آتش کدہ محبت" رکھا یہ مخطوطہ مکمل ہے اور بہت عمدہ کاغذ پر خاص اہتمام سے لکھا ہوا ہے" (تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو: ص ۱۸۱)

دیوانِ پروانہ

دیوانِ پروانہ کے نام سے ایک ناقص الطرفین کرم خوردہ مختصر مخطوطہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے کتب خانہ خاص میں زیر نشان ۳/۱۳۶ محفوظ ہے جو دیوان نہیں بلکہ انتخاب ہے۔ ابتداء میں یہ عبارت ہے۔

"در دیوان دیباچہ کتاب وعدہ رفتہ کہ در پایانِ کلیات حضرت خواجہ قدس سرہ برفی از نتائج طبع خود را اثبات خواہم نمود و بذریعہ طفیلی بودن آنجناب سرمایۂ اعتبار خود خواہم افروز۔ اکنوں وقت آں آمد کہ وعدہ را وفا کنم و کلاہ گوشۂ افتخار بعشری شکنم۔ اشعار فقیر ضیاء الدین پروانہ تخلص"

عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروانہ نے سراج کا دیوان مرتب کیا تھا اور اس دیباچہ میں وعدہ کیا تھا کہ کلام سراج کے بعد وہ اپنا کلام بھی درج کریں گے۔ یہ اسی وعدہ کی تکمیل میں مرتب ہوا۔ گویا ایک ہی مخطوطہ کا دوسرا حصہ ہے مخطوطہ کے ابتدائی ۵ صفحات پر فارسی اشعار ہیں۔ پانچویں صفحہ کے آخر سے اردو کلام شروع ہو گیا ہے۔ اس صفحہ پر اردو کے دو شعر ہیں۔

الٰہی کر مجھے بحر المعانی
کروں معنی کی تامیں در فشانی

مسجد و میکدہ حرم و دیر
سب میں روشن ہے شمع نین کوئی غیر

اضواء السراج:

اس تصنیف کا صرف نام معلوم ہوسکا برصغیر کے کسی بھی کتب خانہ میں اس کا نسخہ محفوظ نہیں ہے۔ پروانہ نے "انوار السراج" میں اس کا ذکر کیا ہے۔

"احوال آنحضرت از حدود احدی و ستین و مایہ و الف تا وصالِ مقدس فقیر در اضواء السراج کہ ملفوظات آنحضرت بہ تفصیل نوشتہ ام"

پروانہ نے سراج کے مرتبہ الفخر الفقری پر فائز ہونے کے سال (۱۱۶۱ھ) سے ان کے وصال (۱۱۷۷ھ) تک کے حالات اس میں درج کیے تھے۔ مخطوطہ کی عدم دستیابی کی وجہ سے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

انوار السراج

یہ پروانہ کی قلمی کاوشوں کے سلسلہ کی آخری کڑی ہے اور ۱۲۰۳ھ کی تالیف ہے اس کا ایک ناقص الآخر مخطوطہ تحسین سروری مرحوم کی ملکیت تھا جس میں صرف ۱۳ اوراق ہیں۔ مرحوم تحسین سروری نے اس کی ایک عکسی نقل ازراہ خلوص و عنایت ہمیں فراہم کی تھی جو محفوظ ہے کسی بھی کتب خانہ میں اس کی نقل کی موجودگی کا علم نہ ہوسکا۔ ہم نے اپنی کتاب "سراج اورنگ آبادی" (مطبوعہ ۱۹۸۴ء) میں اس کے اہم حصے بطور ضمیمہ شائع کیے تھے۔ یہ دراصل ایک کتاب نہیں بلکہ اس میں کئی کتابیں شامل ہیں۔

(۱) متن میں سراج کے حالاتِ زندگی از ابتداء (سال پیدائش ۱۱۲۴ھ) تا ۱۱۶۱ھ درج ہیں گویا حیات سراج کا حصہ اوّل انوار السراج ہے اور حصہ دوم اضواء السراج! اس تحریر کے ذریعہ سراج کے بارے میں اہم مستند معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

(۲) متن ہی میں "دیباچہ منتخب دیوانہا" بھی شامل ہے اس سے قبل بعض تذکروں میں صرف اقتباسات دیے گئے تھے۔ مکمل دیباچہ اسی کے ذریعہ فراہم ہوا ہے۔ سراج نے اپنے پسندیدہ اشعار کا ایک انتخاب مرتب کیا تھا اور اس کا نام "منتخب دیوانہا" رکھا تھا اس کا دیباچہ دراصل ان کی خود نوشت ہے۔

(۳) ضمنی طور پر پروانہ نے اپنے حالاتِ زندگی بھی تحریر کر دیے ہیں۔

(۴) متن کے تین طرف حاشیہ میں کلامِ سراج درج ہے جس کی ابتداء مثنویوں سے ہوتی ہے۔ ان کے بعد ردیف وار غزلیں ہیں۔

(۵) بیرونی حاشیہ میں کلامِ پروانہ ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ جس عنوان پر سراج کی مثنوی ہے اسی عنوان کے تحت پروانہ نے مثنوی لکھا ہے جس زمین میں سراج کی غزل ہے اسی زمین میں پروانہ کی غزل بھی ہے ہر دو کی پہلی غزل کے مطلعے درج ہیں۔

سراج
مطلع:

نام تیرا مطلع فہرست ہے دیوان کا
ہے زباں کا ورد خاصہ اور وظیفہ جان کا

مقطع:

اے سراج اپنی خودی کوں بیخودی میں محو کر
شغل جاری رکھ ہر دم ھو الرحمٰن کا

پروانہ
مطلع:

ہے مرا دیوان تتبع شاہ کے دیوان کا
جسم و جاں ہے آئینہ اس شہ کے جسم و جان کا

مقطع:

ہے رضا تسلیم سیں پروانہ ہر دم میں نثار
اب سراج الدین محمد عاشقِ رحمان کا

*******


## اقوال و امثال

یوسف بخاری دہلوی

صفحات: ۱۰۰۸

قیمت: =/۴۵۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

جرمن کہانی

# ایک میز ایک میز ہے

مصنف: پیٹر بخسل

ترجمہ: منیر الدین احمد

میں ایک بڈھے کی کہانی سنانی چاہتا ہوں۔ ایک آدمی کی جو بالکل بات نہیں کرتا۔ ایک تھکا ماندہ چہرہ رکھتا ہے تھکن کے سبب مسکرانے تک سے لاچار ہے، اور تھکن کے ہاتھوں خفا ہونے تک سے معذور۔ وہ ایک چھوٹے سے شہر میں رہتا ہے، سڑک کی نکڑ پر یا چوک کے قریب۔ اس کے بارے میں کچھ کہنے کا فائدہ نہیں ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہو۔ وہ خاکستری رنگ کا ہیٹ پہنتا ہے، خاکستری کوٹ اور سردیوں میں لمبا خاکستری اوور کوٹ۔ اور اس کی گردن پتلی اور لمبی ہے جس کی جلد خشک ہے اور جھریاں دار۔ سفید قمیض کا کالر اس کے لیے بہت فراخ ہے۔

اس کا کمرہ مکان کی سب سے اوپر والی منزل میں ہے۔ شاید وہ کبھی شادی شدہ تھا اور اُس کے بچے تھے۔ شاید وہ پہلے کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ یقیناً وہ کسی زمانے میں بچہ تھا۔ مگر یہ اس وقت کی بات ہے، جب بچوں کو بڑوں جیسے کپڑے پہنائے جاتے تھے۔ یہ چیز انسان دادی اماں کی فوٹو البم میں دیکھ سکتا ہے۔ اس کے کمرے میں دو کرسیاں ہیں، ایک میز، ایک قالین، ایک بستر اور ایک الماری۔ ایک چھوٹی سی میز پر الارم رکھا ہے۔ اس کے پاس پرانے اخبار اور فوٹو البم۔ دیوار پر ایک آئینہ لٹک رہا ہے اور ایک تصویر۔

بڈھا صبح سویرے اور پچھلے پہر سیر کو جاتا تھا۔ اپنے ہمسائے سے دو چار الفاظ کہتا تھا اور شام کو اپنی میز پر بیٹھتا تھا۔

اس میں کوئی تبدیلی نہ آتی تھی۔ اتوار کے روز بھی یہی کچھ ہوتا تھا۔ اور جب وہ آدمی میز پر بیٹھتا تھا، تو الارم کلاک کی ٹک ٹک سنتا تھا۔ ہمیشہ الارم کلاک کی ٹک ٹک۔

پھر ایک دفعہ ایک خاص دن آیا۔ اس روز سورج نکلا ہوا تھا۔ گرمی کچھ ایسی زیادہ نہ تھی اور نہ ہی سردی تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ تھی۔ خوش باش لوگ تھے۔ کھیلتے ہوئے بچے تھے۔ خاص چیز یہ تھی کہ یہ ساری چیزیں اس آدمی کو یکدم اچھی لگی تھیں۔ وہ مسکرایا تھا۔

"اب ہر چیز میں تبدیلی آجائے گی۔" اس نے سوچا۔ اس نے قمیص کا اوپر والا بٹن کھول دیا۔ ہیٹ کو ہاتھ میں لے لیا۔ اپنی چال کو تیز کر دیا۔ بلکہ چلتے ہوئے کچھ جھومنے سا لگا، بے حد خوش۔ وہ اپنی گلی میں داخل ہوا۔ بچوں کو سر کے اشارے سے سلام کیا۔ اپنے مکان پر گیا۔ سیڑھیاں چڑھا۔ چابی جیب میں سے نکالی اور اپنے کمرے کا تالا کھولا۔

مگر کمرے میں ہر چیز ویسی ہی تھی۔ ایک میز، دو کرسیاں، ایک بستر۔ اور جب وہ بیٹھ گیا، تو اس کو الارم کلاک کی ٹک ٹک

سنائی دی۔ ساری خوشی ہرن ہو گئی۔ کیونکہ کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔

اور آدمی کو طیش آگیا۔

اس نے آئینے میں اپنے چہرے کو لال سرخ ہوتے ہوئے دیکھا اس نے دیکھا کہ کس طرح اس نے اپنی آنکھیں میچیں۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں کو مکّے میں ڈھالا اور ان کو ہوا میں اٹھایا اور میز پر دے مارا پہلے صرف ایک بار، پھر ایک بار اور پھر بار بار میز پر ڈھول بجاتا چلا گیا اور ساتھ ساتھ چلایا۔

"اب کوئی تبدیلی آنی چاہیے۔ اب کوئی تبدیلی آنی چاہیے"۔

اور اس کو آلارم کلاک سنائی نہ دیا۔ پھر اس کے ہاتھوں میں درد ہونے لگا۔ اس کی آواز بیٹھ گئی۔ پھر اس کو الارم کلاک سنائی دینے لگا اور کسی چیز میں تبدیلی نہ آئی۔

"ہمیشہ وہی میز" آدمی نے کہا "وہی کرسیاں، بستر، تصویر اور میز کو میں اب بھی میز ہی کہتا ہوں۔ تصویر کو تصویر، بستر کا نام بستر ہے۔ اور کرسی کو لوگ کرسی کہتے ہیں۔ آخر کیوں؟" فرانسیسی میں بستر کو کولی کہتے ہیں، میز کو طبل، تصویر کو طابلو اور کرسی کو شیز اور ہر کوئی سمجھ جاتا ہے۔ اور چینی بھی ایک دوسرے کی بات کو سمجھتے ہیں۔"

"آخر بستر کا نام کس وجہ سے تصویر نہیں۔" آدمی مسکرا دیا۔ پھر ہنسا اور ہنستا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ہمسایوں نے دیوار پر مکّے برسائے اور پکارے۔

"خاموش"۔

"اب ہر چیز میں تبدیلی آجائے گی" وہ چلایا اور پھر وہ بستر کو اسی وقت سے تصویر کہنے لگا۔

"میں تھکا ہوا ہوں۔ میں تصویر میں جاتا ہوں" اس نے کہا اور صبح وہ اکثر تصویر میں پڑا رہتا اور سوچتا رہتا کہ وہ کرسی کو کیا نام دینا چاہتا ہے۔ پھر اس نے کرسی کو آلارم کلاک کا نام دے دیا۔

وہ اٹھا، کپڑے پہنے۔ الارم کلاک پر بیٹھا اور بازوؤں کو میز پر ٹکا دیا۔ مگر اب میز کا نام میز نہیں ہے۔ اس کا نام اب قالین ہے۔ صبح کے وقت گویا آدمی تصویر میں سے اٹھتا، کپڑے پہنتا، قالین کے ساتھ الارم کلاک پر بیٹھتا اور سوچتا کہ وہ اب کس چیز کو کیا نام دے سکتا تھا۔

بستر کو وہ تصویر کہتا تھا

میز کو وہ قالین کہتا تھا

کرسی کو وہ الارم کلاک کہتا تھا

اخبار کو وہ بستر کہتا تھا

آئینے کو وہ کرسی کہتا تھا

الارم کلاک کو وہ اخبار کہتا تھا

قالین کو الماری کہتا تھا

تصویر کو وہ میز کہتا تھا

اور فوٹو البم کو وہ آئینہ کہتا تھا

گویا بڈھا آدمی دیر تک تصویر میں پڑا رہا۔ نو بجے فوٹو البم نے آلارم دیا۔ آدمی اٹھا اور الماری پر کھڑا ہو گیا، تاکہ پاؤں کو ٹھنڈ

نہ لگے۔ پھر اس نے اپنے کپڑے اخبار میں سے نکالے اور پہن لیے۔ دیوار پر کرسی میں نظر ڈالی۔ پھر الارم کلاک پر بیٹھ گیا قالین کے ساتھ اور آئینے کی ورق گردانی کی یہاں تک کہ اس کو اپنی ماں کی میز مل گئی۔

آدمی کو لطف آنے لگا اور وہ سارا سارا دن مشق کرنے لگا اور نئے نئے الفاظ حفظ کرنے لگا۔ اب ہر چیز کو نیا نام دے دیا گیا۔ اب وہ آدمی نہیں تھا، بلکہ پاؤں تھا اور پاؤں صبح تھا اور صبح ایک آدمی تھا۔

اب تم کہانی کو خود آگے لکھ سکتے ہو۔ اور اس آدمی کی طرح دوسرے الفاظ بھی بدل سکتے ہو۔

بجنے کا نام ہے رکھنا
ٹھٹھرنے کا نام ہے دیکھنا
لیٹنے کا نام ہے بجنا
کھڑے ہونے کا نام ہے ٹھٹھرنا
رکھنے کا نام ہے ورق گردانی
اس کا مطلب بنتا ہے

صبح بڈھا پاؤں دیر تک تصویر میں بجتا رہا۔ نو بجے فوٹو البم رکھ دیا۔ پاؤں ٹھٹھرنے لگا اور الماری پر ورق گردانی کرنے لگا، تاکہ صبح کو نہ دیکھے۔

بڈھے آدمی نے نیلے رنگ کی کاپیاں خریدیں اور نئے الفاظ کے ساتھ ان کو بھر دیا۔ اس کام میں وہ بے حد مصروف ہو گیا اور لوگ اسے سڑک پر شاذ و نادر ہی دیکھتے تھے۔

پھر اس نے ساری چیزوں کے نئے ناموں کو یاد کر لیا اور ان کے اصل ناموں کو بھولتا چلا گیا۔ اب اس کی زبان نئی تھی، جو اس کی اکیلے کی ملکیت تھی۔

کبھی کبھار اسے نئی زبان میں خواب بھی آنے لگے۔ پھر اس نے اپنے مدرسے کے دنوں کے گیتوں کا نئی زبان میں ترجمہ کیا اور ان کو مدھم آواز میں گانے لگا۔

مگر جلد ہی اس کو ترجمہ کرنے میں دقت پیش آنے لگی۔ اس کو اپنی پرانی زبان قریب قریب بھول چکی تھی۔ اور اس کو موزوں الفاظ اپنی نیلی کاپی میں تلاش کرنے پڑتے تھے۔ اسے لوگوں کے ساتھ بات کرنے سے ڈر لگنے لگا۔ اسے دیر تک سوچنا پڑتا تھا کہ لوگ چیزوں کو کس نام سے پکارتے تھے۔

اس کی تصویر کو لوگ بستر کہتے ہیں
اس کے قالین کو لوگ میز کہتے ہیں
اس کے الارم کلاک کو لوگ کرسی کہتے ہیں
اس کے بستر کو لوگ اخبار کہتے ہیں
اس کی کرسی کو لوگ آئینہ کہتے ہیں
اس کے فوٹو البم کو لوگ الارم کلاک کہتے ہیں
اس کے اخبار کو لوگ الماری کہتے ہیں
اس کی الماری کو لوگ قالین کہتے ہیں

اس کی میز کو لوگ تصویر کہتے ہیں
اس کے آئینے کو لوگ فوٹو البم کہتے ہیں

اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ آدمی کو ہنسنا پڑتا تھا، جب وہ لوگوں کو باتیں کرتے ہوئے سنتا تھا۔ اسے ہنسنا پڑتا تھا جب وہ کسی کو کہتے ہوئے سنتا تھا۔

"کیا آپ بھی صبح فٹ بال کا میچ دیکھنے جائیں گے؟" یا جب کوئی کہتا تھا "لگاتار دو ماہ سے بارش ہو رہی ہے"۔ "یا جب کوئی کہتا تھا" میرا ایک چچا امریکہ میں ہوتا ہے"۔

اس کو ہنسی آجاتی تھی، کیوں کہ وہ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ مگر یہ کہانی کچھ ایسی مزاحیہ نہیں ہے۔ اس کی ابتداء مغموم ہوئی تھی اور اس کی انتہا مغموم ہے۔

بڈھا آدمی خاکستری اوور کوٹ میں لوگوں کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ یہ بات کچھ ایسی رنج دہ نہ تھی۔ اس سے کہیں بڑھ کر رنج کی بات یہ ہے کہ وہ اس کو نہ سمجھ سکتے تھے۔ اس لیے وہ کچھ نہیں کہتا تھا اس نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ صرف اپنے آپ سے باتیں کرتا تھا۔ اس نے سلام تک کرنا چھوڑ دیا تھا۔

## اعلان

### ہمبرگ پبلک لائبریری کے لیے

ڈاکٹر منیر ڈی احمد صاحب نے پاکستانی اہلِ قلم کی کتب طلب فرمائی ہیں۔ تمام اہلِ قلم حضرات سے استدعا ہے کہ وہ اگر ہمبرگ پبلک لائبریری کے لیے کتب تحفتاً عطا کرنا چاہتے ہیں تو وہ انجمن ترقی اردو پاکستان ڈی ۱۵۹، بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰ کے پتے پر ارسال فرمائیں۔ انجمن ان کتب کو ہمبرگ بھجوانے کا انتظام کردے گی۔ دسمبر ۹۵ء تک کتابیں انجمن میں موصول ہوجائیں۔

اگر بعض اہلِ قلم براہ راست اپنی کتب ارسال کرنا چاہیں تو پتہ درج ذیل ہے۔

**Dr Munir D Ahmed**
Deutsches orient
**Institut**
Mittelwege 150 - 20148 Hamburg
**GERMANY**

قومی زبان (۶۳) نومبر ۱۹۹۵ء

# روشنی میں چلتے ہوئے

شاعر: آکٹیویو پاز

مترجم: انور زاہدی

تم اپنا بایاں پیر آگے اٹھاتی ہو
تو دن رک جاتا ہے اور ہنستا ہے
اور ہلکے ہلکے قدم اٹھانے لگتا ہے
جب کہ سورج ساکت رہتا ہے
تم اپنا داہنا پیر آگے اٹھاتی ہو
تو سورج اُس دن سے،
جو درختوں میں ساکت ہے
آہستگی کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے نکل جاتا ہے
اپنی چھاتیاں اونچی کیے
تم چہل قدمی کرتی ہو
درخت چلتے ہیں
سورج تعاقب کرتا ہے
دن تمہیں ملنے کو جاتا ہے
آسمان اچانک بادل ایجاد کرتا ہے

قومی زبان (۶۴) نومبر ۱۹۹۵ء

ایک نئی ایرانی نظم

# باغِ آشنائی

حسین فرازمند
معین نظامی

مجھے پہچانتی ہیں
یہ کچی اور پرانی گلیاں مجھے پہچانتی ہیں
یہ سچے اور کھرے دوست، دشمن مجھے پہچانتے ہیں
یہ روشیں اور کھڑکیاں مجھے پہچانتی ہیں
دالان کی یہ بوڑھی اور متروک ہشت گوشہ ڈیوڑھی!
یہ سیڑھیاں، یہ پرنالہ!
ستور کے پیچھے والی اس کوٹھڑی کا اندھیرا!
اس دیوار کے پُرازوہم سائے!
یہ آسمان .... میری بلوغت کے سرسبز دور میں میرا بہترین دوست تھا!
اور یہ سرد، بچپن میں میرا ہمجولی رہا ہے
تمھیں یاد ہے کہ ایک دن
بابا کے صحن کے آخر میں اُگے ہوئے دو بوڑھے سفیدوں سے
میں نے تمھارے لیے کیسے جھولا باندھا تھا!
اور کچھ ہی برسوں بعد جھولا تم سے دُھن گیا تھا
تمھیں یاد ہے اسکول کے اُس طرف دو گلیاں تھیں؟
خوف سے بھری ہوئی ایک کلاس!
اُستاد کی تر و تازہ چھڑی اور سبق کی زیرِ لب آوازیں!
کچھ فاصلے پر ٹافیوں اور مٹھائیوں کی دکان، پنسلوں کی دکان!
یادوں سے بھری ہوئی غبار آلود دکانیں
مجھے پکارتی ہیں!

نوٹ بک کے پہلے صفحے پر لکھنا
کتنا دلچسپ اور اچھا لگتا ہے!
سائنس کی کتاب کی بو!
ضرب کا ایک نامکمل سوال!
گھر آنے کے لیے ایک قطار!
شرارتوں سے بھرا ہوا ایک بستہ!
اور پندرہ نمبروں والا ایک پرچہ!

میں وہاں بے کاری کے بنچوں پر بیٹھا رہتا تھا
اور جب کبھی اُداس ہوتا
تو تمھیں سوچنے لگ جاتا
میں درختوں کے گیلے گیلے شانوں پر خط لکھا کرتا تھا
دو دل، ایک تیر..... ایک یادگار!

میں اُن دنوں رات کی بارش کی طرح سادا تھا
میرا دل کوئی بُلبُلہ نہیں تھا
کہ کسی غم کی شبنم سے ٹوٹ جاتا!
لیکن ایک دن تمھارے ہاتھ سے گِر کر چینی کے گلدان کی طرح ٹوٹ گیا
اور یوں میرا دل مسافر ہو گیا
میں نے اسے بہت آوازیں دیں
وہ نہ آیا

تُم.....!
کیا تم مجھے پہچانتی ہو؟
میں جو تیس سال سے کچھ اُوپر کا ہو گیا ہوں
تمھیں چاہنے، اپنانے کی آرزو نے محال میں جی رہا ہوں
میں نے اپنی آنکھوں پر
معرفت کے شیشوں کی عینک لگالی ہے
میری کنپٹیوں کے بال سفید ہو گئے ہیں
کیا تم مجھے پہچانتی ہو؟

کیا تم مجھے ایک معمولی اور تھکا ہارا انسان نہیں سمجھتیں؟
میں کہ جو اِس پرانے ہینڈ بیگ میں
شعروں بھری ایک بیاض کو اِدھر اُدھر لیے پھرتا ہوں
جسے فنِ اشاعت کی بے مہری نے آزردہ کر رکھا ہے!
کیا تم مجھے پہچانتی ہو؟
سڑک مجھے پہچانتی ہے!
بازار اور پھلوں سے بھرے ہوئے چوک
یہ جمود زدہ سٹیشن اور اڈے
یہ "خوش آمدید"، بغیر اجازت اندر آنا منع ہے"،
اور "یہ شارعِ عام نہیں ہے" کی بے نیاز تختیاں
اور یہ راہرو جو زندگی کے فٹ پاتھ پر سے گذر رہے ہیں!
کیا تم مجھے پہچانتی ہو؟
میں کہ جو تیس سے کچھ اوپر برسوں سے
تمھارے بِن مرتا چلا آرہا ہوں!

# مالیاتی اداروں میں
# ایک امتیازی نام

## آئی سی پی اپنی اسکیموں پر
## غیر معمولی منافع
## فراہم کرتا ہے

### انویسٹمنٹ اکاؤنٹ

آئی سی پی آپ کے لیئے اسٹاک مارکیٹ کے
بہترین شیئرز منتخب کر کے آمدنی بصورت
کیپٹیل گین اور ڈیویڈنڈ مہیا کرتا ہے۔ یہ ایک نان شیئرنگ
(Discretionary or Non-Discretionary)
اکاؤنٹ ہے جو کم از کم ۵۰،۰۰۰ روپے سے کھولا جا سکتا ہے۔

### میوچل فنڈز

آئی سی پی اپنے میوچل فنڈز اور
SEMF پر معقول ڈیویڈنڈ ادا کرتا ہے۔

### ٹرم ڈیپازٹ اکاؤنٹ

آئی سی پی ایک سے پانچ سال تک کے ٹرم ڈیپازٹ پر بہترین
منافع ادا کرتا ہے۔ یہ اکاؤنٹ کم از کم ۵۰،۰۰۰ روپے سے کھولا جا سکتا ہے۔

## آئی سی پی ۔ منافع بخش انویسٹمنٹ میں آپ کا معاون

تفصیلات کے لیئے آئی سی پی کے دفاتر سے رجوع کیجیے۔

# انویسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان

کراچی
فون: ۵۱-۵۶۸۲۰۳، ۵۶۸۵۲۳۴، ۵۶۸۵۱۵
فیکس: ۹۲-۰۲۱-۵۶۸۰۰۳۵

لاہور
فون: ۶۳۰۰۱۹۱-۶۳۰۵۳۱۵-۶۳۰۲۲۳۲-۶۳۰۳۲۲۲
فیکس: ۶۳۰۵۳۲۹-۶۳۰۵۳۰۰

پشاور
فون: ۲۷۴۹۵۷، ۲۷۵۷۵۶، ۲۷۴۲۷۴
فیکس: ۹۲-۰۵۲۱-۲۷۴۷۵۹

راولپنڈی
فون: ۵۶۸۰۹۴-۸، ۵۶۸۵۰۵
فیکس: ۹۲-۰۵۱-۵۶۷۶۰۸

فیصل آباد
فون: ۳۹۶۷۰۹
فیکس: ۹۲-۰۴۱-۳۹۳۳۰

کوئٹہ
فون: ۶۱۸۳۰، ۶۵۳۸۰
فیکس: ۹۲-۰۸۱-۶۵۳۸۰

ملتان
فون: ۳۹۶۷۹، ۷۳۴۷۴، ۵۲۳۳
فیکس: ۹۲-۰۶۱-۳۹۶۷۹

حیدر آباد
فون: ۷۸۶۸۵، ۷۸۶۷۲، ۷۸۰۶۹۷
فیکس: ۹۲-۰۲۲۱-۷۸۶۷۲

اسلام آباد
فون: ۲۳-۸۲۲۶۲۳، ۸۲۸۷۴
فیکس: ۹۲-۰۵۱-۸۲۸۷۴

سکھر
فون: ۲۳۵۴۱، ۲۳۲۱۸، ۲۳۵۷۳
فیکس: ۹۲-۰۷۱-۲۳۴۹۳

OSCAR

# رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

## معتوب

(ناول)

امراؤ طارق

صفحات ۴۳۹، قیمت =/۲۰۰ روپے

مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبرز۔ عبداللہ ہارون روڈ کراچی

"معتوب" جناب امراؤ طارق کا پہلا ناول ہے، اس پر کوئی تبصرہ کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس ناول کا بنیادی اسٹرکچر جدید ناول کا ہے۔ اور یہ تو ہم سب کو معلوم ہے کہ جیسا اسٹرکچر ہوتا ہے۔ عمارت بھی اُسی مناسبت سے تعمیر ہوتی ہے، یعنی اس کے ستون اُس کے سقفِ وبام، اُس کی نقاشی اور پچی کاریاں اُسی رنگ میں رنگی ہوتی ہیں۔ آپ میری اِس رائے سے اُس وقت اتفاق کریں گے جب یہ ناول زیرِ مطالعہ آئے گا۔

ناول کا اسلوب بیانیہ ہے، کہانی سنانے کا سا انداز! لفظ بیانیہ سے چونکیے نہیں۔ یہ کہانی سُنانے کا بڑا مؤثر وسیلہ ہے، اور اساطیر کے زمانے سے آج تک یہ ایک طرح سے مؤثر وسیلہ رہا ہے۔ بیانیہ کی اہمیت کا اندازہ تو داروف کے اِس مقولے سے کیا جاسکتا ہے۔

Naration equals life:
The absence of naration is Death .

ناول تین بڑے حصّوں یا ابواب میں تقسیم ہے، پہلا باب "عنائم کے تراہے پر تامار" طویل تر ہے، دوسرا باب "ہستنا پور کا بندی" اور تیسرا باب "ایک طویل تھکا دینے والا دن" ہے پہلا باب ایک عورت کے کنفیشن Confession پر مشتمل ہے جو وہ فادر ولکاکس کے سامنے بیان کرتی ہے۔ اِس کے اعتراف سے "جو باتیں عیاں ہوتی ہیں وہ یہ کہ وہ ایک Rare قسم کی عورت ہے۔ ایک ایسی عورت جس کی جنسی خواہشات' جنس زدگی کے مقام کو چھوتی ہے اور اس معنیٰ میں وہ ایک غیر معمولی عورت ہے۔ بہت ہی خوبصورت، بہت ہی ذہین، ایک نظر میں کسی کو اپنا بنانے کی صلاحیت کے سولہ سنگار سے آراستہ لیکن مزاج اِس ڈھب کا کہ وہ کہیں قیام کرنا ہی نہیں چاہتی، کوئی مستقل مستقر اس کے لیے ناپسندیدہ! اِک آدھ بار کہیں کسی پیڑ سے اپنا رشتہ ہموار بھی کیا اور پھول پھل بھی لگے۔ لیکن اپنی اُفتادِ طبع سے مجبور اِس پیڑ کے سایہ سے جلد ہی اُکتا گئی۔ تمام زندگی اِس کا یہ معمول رہا، کہ ہر مرتبہ کسی کو نیا دوست بنایا اور جب اُس سے اُس کی طبیعت بھر گئی اُسے بھلا دیا اور دوسرے پیڑ پر جا بیٹھی، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہ خاتون جنس زدگی اور پریشان فکری میں جیمس جوائس کے ناول یولی سس کی ایک اہم کردار مولی بلوم سے ایک حد تک ملتی جلتی نظر آئی۔ بہ الفاظ دگر ناولِ معتوب کی اس بے نام عورت میں ایک آوارہ منش کی شعوریت ہے، جنسی اختلاط کے استعمال میں ہر طرح کی آزادی روا رکھتی ہے۔

امروز جو آرٹسٹ ہونے کے ناتے اُس عورت کے آرٹسٹک پیکر کا پرستار ہے اس نے اِس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ خاتون اپنے موجودہ رویّے سے باز آجائے۔ اور اب بھی وقت ہے کہ کسی ایک پیڑ کے سائے کی ہو کر رہ جائے۔ اس طرح حسن کا زیاں اُس کے لیے قابلِ قبول نہ تھا، وہ عورت امروز کے لیے دل میں نرم گوشہ بھی رکھتی تھی، لیکن وہ امروز کی پرستاری سے خائف تھی، کبھی کبھی دخل در معقولات پر امروز سے اُس عورت کی نوک جھونک بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن کسی ایک کے ہو رہنے کا تصور ہی اس کے لیے عذاب ناک تھا۔ وہ اپنے مخصوص رویّے کے بہاؤ میں اتنی دور نکل چکی تھی، کہ واپس آنا تقریباً ناممکن تھا۔ شاید ایسی ہی نوک جھونک میں امروز نے اُس خاتون سے ایک موقع پر کہہ دیا تھا:

"تم اُس جوتے کے مانند ہو جو سرائے کی ڈیوڑھی کے باہر پڑا رہتا ہے اور جسے سرائے میں عارضی قیام کرنے والا ہر مسافر ضرورت کے وقت بغیر کسی پس و پیش کے استعمال کرتا ہے، گورے کالے، گندے اور صاف ہر طرح کے پاؤں اِسے پہنتے اور اتارتے ہیں اور بے دریغ استعمال سے اِس کی سیون جگہ جگہ سے اُدھڑ گئی ہے، اور صورت اتنی بدل گئی ہے کہ اب اُسے جوتا کہنا مشکل ہے"

ناول "معتوب" کا آغاز اور خاتون کردار کا کنفشن اُنھیں جملوں سے ہوتا ہے اور کنفشن کا اختتام اِس مقام پر ہوتا ہے کہ خود فادر ولکاکس اُس خاتون کے حُسن کے سحر میں آجاتا ہے۔ وہ اس خاتون کے گھر جاتا ہے۔ اور اُس کے ساتھ بھی وہی ہوتا ہے جو دوسرے بہت سے مردوں کے ساتھ پیش آیا۔ فادر ولکاکس اپنے تمام تر تزکیۂ نفس کے باوجود خاتون کی سپردگی کے آگے بے سپر اور بے بس ہو جاتا ہے۔ پھر جب آسودگی کے سارے مرحلے طے ہو چکتے ہیں تو خاتون فادر ولکاکس کو بازو والے کمرے میں لے جاتی ہے، ایک سوئے ہوئے آدمی پر پڑی ہوئی سفید چادر سرکاتی ہے اور فادر ولکاکس کو مخاطب کرتی ہے۔ "فادر یہ امروز ہے میں نے اسے مار ڈالا ہے" اِس پر فادر اُس خاتون کو مشورہ دیتا ہے کہ اُسے خود کو قانون کے حوالے کر دینا چاہیے۔"

فادر ولکاکس یہ کہہ کر چلا جاتا ہے، وہ خاتون اِس خوف میں مبتلا ہوتی ہے کہ فادر ولکاکس ضرور اس واردات کی اطلاع قانونی ادارے کو دے دے گا۔ چنانچہ اُس کے جاتے ہی وہ امروز کی لاش کو اپنی کار میں رکھ کر، رات کے سناٹے میں سمندر کے حوالے کر دیتی ہے،

ادھر فادر ولکاکس قانونی ادارے کو اس قتل کی اطلاع دے دیتا ہے اور فوراً محکمہ پولیس کے غوطہ خور حرکت میں آجاتے ہیں لیکن لاش کا کہیں پتا نہیں چلتا۔ البتہ فادر ولکاکس سے امروز کی روح کا مکالمہ شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ "ہستنا پور کا بندی" کا پورا باب اِسی کے بیان کردہ واقعات و واردات کے گرد گھومتا ہے۔ جس سے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد "ہستنا پور کے بندی" کے سابق مشرقی پاکستان میں قیام کا پتا چلتا ہے۔ پھر وہ جنگی قیدی کی صورت میں اتر پردیش (بھارت) کے کسی اسٹیشن میں موقع نکال کر بھاگ نکلتا ہے۔ یہ اسٹیشن چونکہ اس جنگی قیدی کے گاؤں سے قریب ہے اس لیے بس کے ذریعے گاؤں پہنچ جاتا ہے۔ گاؤں میں قانونی ادارے کی طرف سے اُس کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر اس کا خانہ زاد ملازم بفاتی کام آتا ہے۔ جس کی بس اسٹینڈ پر اب چائے کی دکان ہے۔ بفاتی اور اس کا اسکول کے زمانے کا ساتھی ست نارائن، اُس کو سرحد پار کرانے میں معاون ہوتے ہیں۔ یہ سفر سمندری ہے لانچ کا سربراہ ہے لکھا پڑھا معلوم ہوتا ہے۔ وہ تمام راستے وقت گزاری کے لیے سندھ کی تاریخ بیان کرتا جاتا ہے اِس طرح دوسرے باب کی بدولت ناول کا قاری سندھ کی تاریخ سے بھی بہت حد تک واقف ہو جاتا ہے۔

ناول کا تیسرا باب عدالت کی کاروائی پر مشتمل ہے۔ خاتون کے خلاف قتل کا مقدمہ دائر ہے۔ ایک پیشی میں کچہری کے

آس پاس زبردست دھماکہ ہوتا ہے ۔ سارا علاقہ گرد و غبار اور چیخ و پکار سے بھر جاتا ہے۔ موقع غنیمت جان کر وہ خاتون فادر ولکاکس کے ساتھ اپنی گاڑی کو جو کچہری کے پچھلے حصے میں کھڑی تھی، نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اور اندرون سندھ، کی طرف ہائی وے پر تیز رفتاری سے بھاگنے لگتی ہے، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتی ہے جو پاکستان کی آخری سرحد ہے۔ فادر ولکاکس کسی خطرے کے پیش نظر اُس خاتون سے درخواست کرتا ہے کہ واپس لوٹ چلو اس کے باوجود وہ No mans land میں داخل ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر تو وہ چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے پھر ریت کے اونچے ٹیلے کے پیچھے روپوش ہو جاتی ہے۔ فادر ولکاکس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے آیا وہ بھی No mans land میں داخل ہو جائے یا واپس لوٹ جائے!

شروع سے ناول کی بُنت ایسی رہی کہ اُس خاتون کے Where abouts کے بارے میں کچھ نہ پتا چل سکا۔ یعنی یہ کہ اُس کا نام کیا ہے، کہاں کی رہنے والی ہے، کس مذہب سے تعلق ہے اور جب اِس کا اختتام ہوا تو یہاں بھی وہ خاتون اپنے پیچھے قیاس آرائی کا طویل سلسلہ چھوڑ گئی۔ ایسا شخص جس کا نہ کوئی نام ہو نہ مذہب اور نہ یہ کہ کہاں کا رہنے والا یا رہنے والی ہے تو اس کا اختتام بھی اِسی جگہ ہونا چاہیے تھا جو کسی کی زمین نہ ہو۔

ناول شروع سے آخر تک پڑھنے والے کی محویت کو قائم رکھتا ہے۔ بہ ظاہر اس کے تین الگ الگ باب ہیں لیکن اپنا ایک تسلسل رکھتے ہیں، اور تینوں حصے ایک دوسرے سے Well Knit ہیں۔ ناول کی ماجرائیت یا ماجراکاری بڑے ڈھنگ سے اپنا سفر مکمل کرتی ہے اس کے بین السطور بہت سے حالیہ پاکستانی مسائل روشن ہوتے جاتے ہیں جو ناول کو اپ ٹو ڈیٹ بناتے ہیں۔

ناول اپنے برتاوے کے لحاظ سے تازہ دمی کا احساس دلاتا ہے۔ بیان سے شروع ہوتا ہے اور بیان ہی پر ختم ہوتا ہے۔ بیان کی قوت کہیں ڈھیلی نہیں پڑی ہے۔ شروع سے آخر تک ایک تنی ہوئی ڈور کا احساس ہوتا ہے۔

چنانچہ تودوروف کا قول کہ The absence of Naration is death اس ناول پر صادق نہیں آتا۔

## غالب شناسی کے کرشمے

افتخار احمد عدنی

صفحات ۲۲۲، قیمت =/۱۳۰ روپے

پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی ۷۰، شاہراہ قائدِ اعظم۔ لاہور

"غالب شناسی کے کرشمے" غالب پر لکھی گئی بہت سی کتابوں کے ذخیرے میں اپنی الگ پہچان کراتی ہے۔ اِس کتاب کی جستہ جستہ شانِ نزول بھی اوروں سے جداگانہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جن دنوں یہ مضامین قومی زبان کے صفحات پر نمودار ہو رہے تھے، اگر اس کے تسلسل میں کسی وجہ سے رخنہ پڑ جاتا تو اس کے باذوق قارئین یہ سوال کرنے لگتے تھے کہ غالب پر مضامین کا سلسلہ رُک کیوں گیا؟ چنانچہ یہ جواب دے کر اُنھیں مطمئن کیا جاتا تھا کہ سلسلہ رکا نہیں یہ ماندگی کا وقفہ ہے۔ قارئین کی کسی صاحبِ مضمون کے لیے اس عنوان کی جستجو اس بات پر دال ہے کہ ان کا اسلوب پسندیدہ ہے۔

دراصل عدنی صاحب کا اسلوبِ تحریر اتنا پھلوار (Flowery) ہے کہ قارئین اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ ان کی تحریروں میں معنی آفرینی و نکتہ وری اور بذلہ سنجی و لطیف ظریفانہ لہریں اس طرح گھل مل کر رواں ہوتی ہیں کہ ذائقے میں زردہ کے ساتھ زعفران کا بلکہ زعفران زار کا لطف آتا ہے۔ اُن کی تحریر کا ایک اور وصف یہ ہے کہ اس میں تصوف کی چاشنی کی مزاجاً موجودگی۔ ارادتاً نہیں بھی ان کے مضمون کو وقیع اور فکر انگیز بناتی ہے۔

اُردو میں غالب کے ذکر کا آغاز عبدالرحمٰن بجنوری سے ہوا پھر تو یہ سلسلہ چل پڑا۔ غالب کی شخصیت و فن سے والہانہ محبت بہر عنوان اظہار پانے لگی۔ آج سے برسوں پہلے علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر ڈاکٹر مختار الدین احمد نے ترتیب دیا تھا۔ جس کا اس زمانے میں ادبی حلقوں میں زور و شور سے چرچا ہوا۔ مولانا غلام رسول مہر، اور مالک رام کی غالب کے فن و شخصیت پر کتابیں، کالی داس گپتا رضا کی کتاب "دیوانِ غالب کامل" جس میں غالب کی غزلوں کی سنہ وار ترتیب کی گئی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم خلیق کی تالیف "خطوطِ غالب" (چار جلدوں میں) غالب پر مولانا امتیاز علی عرشی کا حجیم تحقیقی کام، ڈاکٹر آفتاب احمد کی تصنیف "غالب آشفتہ نوا" (مطبوعہ انجمن ترقی اردو) پروفیسر ممتاز حسین کی تصنیف "غالب کا ایک مطالعہ" اور مجنوں گورکھ پوری کی کتاب "غالب شخص اور شاعر" غالب شناسی کے باب میں روشنی کے مینار ہیں اِسی سلسلے کی ایک اہم کڑی افتخار احمد عدنی صاحب کی زیرِ نظر کتاب "غالب شناسی کے کرشمے" ہے۔

یہاں جاپانی غالب دوست پروفیسر کاتاؤکا کا ذکر خالی از دلچسپی نہیں کہ انھوں نے حال ہی میں غالب کے کلام کا ترجمہ کتابی شکل میں جاپانی زبان میں شائع کیا ہے۔ پچھلے دنوں وہ کراچی آئے ہوئے تھے غالب کے سلسلے میں پروفیسر کاتاؤکا کے اس اہم کام سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب سے اُردو فارسی کے ناقدین کے علاوہ دیگر زبانوں کے اہلِ علم بھی گہری دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اور اُن کی عظمت کی شناخت میں دوسری زبانوں کے اہلِ نظر ہم سے پیچھے نہیں۔

اس کتاب میں عدنی صاحب نے غالب کی فارسی غزلوں کے اُردو تراجم بھی شامل کیے ہیں۔ اُن کی فارسی غزلوں کے معانی، مطالب اور متون کے نہایت قریب رہ کر ترجمہ کرنے کی شہادت دیتے ہیں، ترجمے کا یہ حسن اس وقت اور ظاہر ہوتا ہے جب ہم غالب کی اُردو اور فارسی غزلوں کو شانہ بشانہ دیکھتے ہیں۔

غالب کے کلام کے ساتھ عدنی صاحب کی والہانہ محبت کا ایک سبب وہ نسبتِ خاص بھی ہے جو اُن کے بزرگوں سے اُن تک پہنچی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے بارے میں لکھتے ہوئے اِن کی تحریر میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ جب وہ غالب کے نجی ذکر میں بے قرار اور از خود رفتہ سے ہونے لگتے ہیں، تو تحریر میں یہ کیفیت کیوں اُجاگر نہیں ہوگی۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔

(ا۔ س)

## مطالعۂ بیدل فکرِ برگساں کی روشنی میں

ترتیب و ترجمہ: ڈاکٹر تحسین فراقی

صفحات ۱۴۲، قیمت = ۷۰/ روپے

اقبال اکادمی پاکستان ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور

ڈاکٹر تحسین فراقی کو "مطالعہ بیدل فکرِ برگساں کی روشنی میں" کے ترتیب و ترجمہ میں نہ جانے کتنے بھاری پتھر اُٹھانے پڑے۔ پہلے تو انھوں نے محمد سہیل عمر کی نشاندہی پر، ڈاکٹر جاوید اقبال کی اجازت سے، اقبال میوزیم سے علامہ کے اُس انگریزی مضمون کا فوٹو اسٹیٹ حاصل کیا جو نوادر کا درجہ رکھتا ہے اور علامہ کی اپنی تحریر (Hand writing) میں رقم ہے۔ جس میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں کانٹ چھانٹ بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس مضمون کو ڈاکٹر تحسین فراقی نے غالباً محدب شیشہ کی مدد سے اپنی تحریروں میں منتقل کیا۔ پھر اُسے انگریزی ٹائپ میں منتقل کر کے خود ہی اُس کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ اور تو اور بیس پچیس صفحات کا ایک بھرپور تعارف بھی لکھ ڈالا۔ تو گویا اتنے جان کھپا دینے والے مراحل سے گزر کر یہ کتاب ہمارے ہاتھوں میں آئی ہے۔

اِس جوئے شیر کے لانے یا اِس ہفت خواں کے سر کرنے میں جو دکھ ڈاکٹر تحسین فراقی نے جھیلا اور پھر اس پتے مار کام کو جس رسان سے انجام تک پہنچایا۔ اس کے لیے ان کی لگن اُن کے انہماک، اور اُن کے ذہنی و جسمانی قویٰ دونوں کو داد دینا اور آفرین کہنا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی بیدل پر بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے، لیکن پھر سوال وہی ہے کہ بیدل پر لکھ کر انصاف کرنے کے لیے شاعروں میں غالب یا اقبال سا ذہن ہو، نثر نگاروں میں میر غلام علی آزاد بلگرامی، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور خواجہ عبادالله اختر جیسے بیدل شناس ہوں۔

مجنوں گورکھپوری نے پردیسی کے خطوط میں بیدل کے بارے میں بہت سے انکشافات کیے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اِس بات کا دکھ بھی ظاہر کیا ہے کہ بیدل کے شایان شان اپنے وطن میں وہ کچھ نہیں لکھا گیا جو لکھا جانا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس برصغیر سے باہر کی دُنیا میں بہ شمول وسطی ایشیائی ممالک وہاں کے اہلِ علم و ادب کی زبانوں پر عزت و احترام کے ساتھ فارسی شعرا میں صرف اور صرف بیدل کا نام آتا ہے۔ وہ ہر طرح سے بیدل کی عظمت کا اعتراف کرتے رہتے ہیں۔ افغانستان تو بیدل کو اپنا قومی شاعر ہی مانتا ہے۔

بیدل کے مختلف دیوان میں ابیات کی تعداد ایک لاکھ سے زائد بتائی جاتی ہے۔ ان کی نثری تصانیف (چہار عنصر وغیرہ) پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں اِن سے اِن کے فکر و فلسفہ اور حکیمانہ افکار، نکات اور آدرش کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کا "خلق جدید" کا تصور ہی تو نیٹشے کے سپر مین اور علامہ کے "مردِ مومن" کے مترادف ہے۔ انھوں نے ڈارون سے تقریباً سو برس پہلے ایک شعر میں انسان کے ارتقا کا ذکر کر دیا ہے:۔

ہیچ شکلے بے ہیولیٰ قابلِ صورت نشد
آدمی ہم پیش ازاں کآ دم شود بو زینہ بود

صرف یہی نہیں اس حوالے سے انسانی ارتقا کے فلسفہ سے بحث بھی کی گئی ہے۔

علامہ اقبال کی مذکورہ تحریر کو کتابی شکل دینے کے لیے ڈاکٹر تحسین فراقی صد آفرین کے مستحق ہیں کہ صاحبانِ فکر کے نزدیک اِس کتاب کی حیثیت ایک تحفہ کی سی ہے۔

کتاب بہت دیدہ زیب شائع ہوئی ہے۔

(ا۔ س)

## آدھی رات کا پورا چاند

جاوید وارثی

صفحات ۳۲۰، قیمت =/۱۵۰ روپے

ای۔ ۳، ریلکس اپارٹمنٹس، بلاک ۲، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

کتاب زیرہ تبصرہ سید جاوید اسلم وارثی کا مجموعہ کلام ہے۔ کتاب کا نام اُن کے اِس شعر سے ماخوذ ہے:

تیری چاہت، تیری باتیں، تیرا سب کچھ یاد آتا ہے
نیل گگن پر جب بھی دیکھوں آدھی رات کا پورا چاند

مجموعہ کلام کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاوید وارثی صاحب غزل کے شاعر ہیں لیکن اُن کی نظمیں بھی جو اس مجموعہ میں شامل ہیں اپنے رنگ و آہنگ اور حسن ادا اور رعنائی خیال میں کچھ کم نہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی آزاد شاعری کے نمونے جو دو مختصر نظموں "نشہ" اور "تو" کی شکل میں نظر افروز ہیں رنگینی و دلکشی سے خالی نہیں۔

یہ کلام اس قابل ہے کہ اس پر کھل کر تبصرہ کیا جائے لیکن "دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار" کے مصداق ایک مختصر تبصرہ میں اس کی گنجائش کہاں سے نکالی جائے۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ جاوید وارثی صاحب حقیقتاً ایک فطری شاعر ہیں اور اُن کے کلام میں بڑی انفرادیت حلاوت اور تاثیر ہے۔ افسر ماہ پوری صاحب کی یہ رائے حقیقت پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ اُن کے خیالات و جذبات میں وہ فراط و تفریط نظر نہیں آتی جس سے شرافت و ثقاہت کی سطحیں مجروح ہوتی ہیں۔ بلکہ اُن کی پوری شاعری جذبات و احساسات کی نزاکت، نفاست اور فکر و نظر کی گہرائی اور ٹھیراؤ کی آئینہ دار ہے جس سے دل کو بالیدگی اور روح کو تازگی محسوس ہوتی ہے۔

اِس اقتباس کی سچائی کے لیے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں اور لطف اندوز ہوں۔

آئے ہے جب کسی کا تصور شراب میں
پیتے ہیں ہم شراب ملا کر شراب میں
پیتے رہے ہیں ڈال کے ساغر میں آج تک
اب سوچتے ہیں ڈال دیں ساغر شراب میں

درسِ عبرت ہے زندگی کیا ہے
اک قیامت ہے زندگی کیا ہے
میرا اپنا مشاہدہ ہے یہی
صرف حسرت ہے زندگی کیا ہے

کرچیاں بکھری ہوئی ہیں ہر طرف احساس کی
دل کے شیشہ پر لگا ہے کیسا پتھر دیکھنا

آخر میں کسی قدر تصرف کے ساتھ افسر ماہ پوری صاحب کا تھوڑا سا اقتباس اور پیش کر دیا جائے۔ "جاوید وارثی کی شاعری وسیع امکانات کی حامل ہے جس کا ثبوت "آدھی رات کا پورا چاند" کے مطالعے سے واضح طور پر ملتا ہے۔

(ثناء الحق صدیقی)

# گلہائے رنگ رنگ

## (جلد دوم)

محمد شمس الحق

صفحات ۷۳۱، قیمت = ۲۵۰/ روپے

نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، لاہور وغیرہ،

اردو غزل کی وسعتیں اُتنی ہی ہیں جتنی مسائلِ زندگی کی۔ حیات انسانی بلکہ کائنات کا کونسا مسئلہ ہوگا جو مختلف انداز سے اِس میں سمویا ہوا نہ ہو۔ مختلف شعرا نے ایک ہی مسئلہ کو اپنے اپنے رنگ میں پیش کر کے جذباتِ انسانی کی رنگا رنگی اور بوقلمونی کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے۔ اِن خوبیوں کے پیش نظر اہلِ ذوق حضرات کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اِس گنجہائے گراں مایہ کو مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دیا جائے۔ تاکہ بوقت ضرورت وہ اپنے مطلوبہ عنوان سے متعلق مختلف شعرا کے نتائجِ فکر سے واقف ہو سکیں۔ زیر تبصرہ کتاب "گلہائے رنگ رنگ" اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مرتب کی گئی ہے مؤلف موصوف جناب محمد شمس الحق نے اپنی حیاتِ مستعار کے تقریباً پچاس سال اسی کام کے لیے وقف کر دیے ہیں۔ کام اتنا بڑا تھا کہ اس تالیف کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا پھر بھی ہر حصہ دو ضخیم جلدوں کی شکل اختیار کر گیا۔ دونوں جلدوں میں ایک ہزار عنوانات کے تحت تیرہ ہزار سے زیادہ اشعار جمع ہو گئے ہیں۔ بیشتر اشعار غزلوں سے لیے گئے ہیں۔ تاہم مناظر سے متعلق کچھ اشعار نظموں اور مرثیوں سے بھی لے لیے گئے ہیں۔ مثلاً جوہرِ مرائی کے عنوان کے تحت میر انیس کا یہ شعر:

یوں پھر رہے تھے بیچ میں فوجِ غنیم کے
جیسے سحر کو چلتے ہوں جھونکے نسیم کے

یا نسیمِ سحری کے عنوان کے تحت میر انیس ہی کا یہ مشہور شعر دیا گیا ہے:

وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

ہر شعر کے ساتھ شاعر کا تخلص بھی دے دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ترتیب زمانی کا خیال رکھا گیا ہے۔ جہاں شاعر کے زمانہ کا تعین نہیں ہو سکا وہاں اخبار بیان و اسلوب کی روشنی میں اُن کا شعر درج کر دیا گیا ہے۔ اشعار کے انتخاب میں اعلیٰ شاعرانہ ذوق کو کام میں لایا گیا ہے۔

اِس حسین گلدستہ کو زیادہ مفید بنانے کے لیے آخر میں شعرا کا مختصر تعارف دیا گیا ہے اور جلد دوم کے ۷۳۱ صفحات پر مزید ۷۸ صفحوں کا اضافہ کر کے اُن پر مختصر حواشی دے دیے گئے ہیں۔

اس مشینی دور میں جب ہر طرف سے یہی صدا کانوں میں آرہی ہے کہ ہر شخص زندگی کے تمام مشاغل سے دست بردار ہو کر اپنی توجہ کو کلیتہً سائنس اور ٹیکنالوجی پر مرکوز کر دے مولف موصوف لائق ستائش ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ وقف کر کے ایک ایسا کام کیا جو موجودہ بے کیف زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔

(ثناء الحق صدیقی)

# اُردو ہائیکو۔ مستقبل اور امکانات

ڈاکٹر یونس حسنی (سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ کراچی)

صفحات ۹۴ قیمت =/۱۰۰ روپے
رباب پبلی کیشنز۔ دہلی کالونی کراچی

ڈاکٹر یونس حسنی صاحب (سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ کراچی) کی تازہ تصنیف "اردو میں ہائیکو مستقبل اور امکانات" ہمارے یہاں ہائیکو شاعری کے کیف وکم کی جانچ پرکھ کی دوسری اہم اور مفصل کتاب ہے۔ (ان سے پہلے ہائی کو کے مشہور اردو شاعر پروفیسر محمد امین۔ زکریا یونیورسٹی۔ ملتان کی کتاب اردو میں ہائیکو نگاری ۱۹۸۷ء میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے شائع ہو چکی ہے۔) اس مختصر سی کتاب میں ہائیکو کا جائزہ چار عنوانات کے تحت لیا گیا ہے۔ پہلا عنوان "جاپان میں ہائیکو کی روایت" ہے۔ یہ صنف چوں کہ اصلاً جاپانی ہے اور ڈاکٹر صاحب نے اس کی قدامت تقریباً پانچ سو سال ہونے کا انکشاف کیا ہے اور اس کے تاریخی شواہد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اِسی عنوان کے تحت جاپانی ہائیکو کی ہئیت، موضوع اور نئے تقاضوں پر سیر حاصل گفتگو کر کے یہ واضح کیا ہے کہ اس صنف کو اردو میں برتتے ہوئے کن تقاضوں کو سامنے رکھا جانا چاہیے۔

دوسرے باب یعنی اردو میں ہائیکو کے ضمن میں انھوں نے ہمارے یہاں اس صنف سے ابتدائی تعارف کی نشاندہی کی ہے یعنی پروفیسر نورالحسن برلاس صاحب نے اب سے تقریباً ساٹھ برس پہلے یہ کام کیا تھا۔ "وہ تیس کی دہائی میں ٹوکیو میں السنۂ غیر کے استاد کی حیثیت سے جاپان گئے اور رسالہ ساقی (دہلی) کے ذریعہ وہاں کی ثقافت، تاریخ، ادب اور ادبی اصناف پر مضامین لکھے۔ ان ہی صفحات میں انھوں نے جاپانی شاعری کی اس مختصر صنف کو بھی پہلی بار متعارف کرایا۔ ان کے بعد پھر دوسرے حضرات نے بھی اس طرف توجہ دی اور اسی توجہ کے سبب شاہد احمد دہلوی نے ساقی کا ایک جاپان نمبر مرتب کیا جو ۲۴۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس نمبر میں پہلی بار ہائیکو سے بھی اردو قارئین کا تعارف بھرپور انداز میں ہوا۔ جس کے نتیجہ میں اردو کے تمام مقتدر رسائل مثلاً ہمایوں، ادبی دنیا، عالمگیر۔ نیرنگِ خیال اور ادبِ لطیف نے جاپانی ہائیکو کے تراجم شائع کرنا شروع کیے۔

اس سے اگلے باب یعنی طبع زاد ہائیکو، میں ڈاکٹر یونس حسنی صاحب نے اردو میں اس صنف کو برتنے کا جائزہ اردو اجتہادات، اور ہیئت میں تجربے، کے ذو ذیلی عنوانات سے لیا ہے۔ اس سے قاری کو اندازہ ہوتا ہے کہ تراجم کی حد تک تو اس صنف کی اصل شکل باقی رہی لیکن طبعزاد سطح پر ہمارے شعرا نے اس صنف کو بھی ہماری شاعری کے مزاج میں ڈھال لیا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "اہلِ اردو نے ہائیکو کے موضوعات ہی میں اجتہاد نہیں کیا ہیئت میں بھی تجربے کیے چنانچہ ہائیکو کے مخصوص انداز میں تین مصرعوں کی جگہ ہمارے شعرا نے چار مصرعوں والی ہائیکو کہہ کر اسے اردو کی قدیم صنف چار مصرعوں والا قطعہ بنا دیا۔ اور بھی کئی ایک ایسے اجتہادات کی نشاندہی کی گئی ہے جس سے اس صنف کے موضوع رنگ اور ڈھنگ مجروح ہوئے ہیں۔

آخری باب یعنی امکانات اس مختصر سی کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے اردو میں اس صنف کے مستقبل کے بارے میں اپنے شعرا سے اچھی توقعات وابستہ کی ہیں اور اس صنف کو زندہ رکھنے کے لیے انھیں چھ نکات پر الگ الگ تفصیل سے بات کر کے اس صنف کے فنی اور موضوعاتی تقاضوں سے اس کے اپنے اصولوں کے مطابق عہدہ برا ہونے کی خوش آئند توقع کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس صنف کے اردو ادب میں اضافے پر واقعتاً بہت خوش ہیں جو ان کی وسیع القلبی کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے دامن کو وسیع تر دیکھنے کی نیک خواہش کا ثبوت ہے۔

کتاب مختصر ۸۵ صفحات پر مشتمل ہوتے ہوئے معانی اور مطالب کے اعتبار سے اس صنف پر کسی دبیز سے دبیز تصنیف کا

کام دیتی ہے اس لیے کہ ڈاکٹر یونس حسنی نے موضوع سے اتنی قربت اور وابستگی برقرار رکھی ہے کہ کہیں ایک سطر بھی موضوع کے دائرہ سے باہر نہیں نکلتی۔ بامقصد اور مثبت تحریر کا یہی خاصہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر یونس حسنی صاحب لائق مبارکباد ہیں کہ اُنھوں نے ایک بڑے موضوع کو اپنے قارئین کے لیے انتہائی شگفتہ اور مفید طلب بنادیا۔

پروفیسر عتیق احمد

## غمِ خاموش کے انداز

ابو ظفر صہبا

صفحات ۱۲۸، قیمت = / ۷۰ روپے

بختیار اکیڈمی۔ اے ۳/۶۹۔ گلشنِ اقبال، کراچی

"غمِ خاموش کے انداز" جناب ابو ظفر صہبا کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ابو ظفر صہبا ممتاز شاعر جناب صبا اکبر آبادی کے تلامذہ خاص میں ہیں، غالب و میر سے نسبت یوں قرار پاتی ہے کہ جناب ابو ظفر کا وطن مالوف بھی تاج محل کے آگرہ یعنی اکبر آباد تھا۔

کتاب کا تعارف معروف افسانہ نگار جناب سلطان جمیل نسیم نے سیدھی لکیر کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ اور خوب کیا ہے، جناب ابو ظفر صہبا، سلطان جمیل نسیم کے طالب العلمی کے زمانے کے اُستاد ہیں، اس رشتے کا احترام اور جذبۂ محبت نہایت موثر اسلوب میں سیدھی لکیر میں، سپردِ قلم ہوا ہے۔

ابو ظفر صہبا کی غزل گوئی کا انداز اکلاسیکی ہے، زبان پر گرفت، لفظوں سے کام لینے کا سلیقہ اور بیان کی بے ساختگی شعر کو پُر لُطف صورت عطا کرتی ہے،

ابو ظفر صہبا اسی عصر کے فرد ہیں چنانچہ سرد و گرم زمانہ کو وہ اُسی طرح محسوس کرتے رہے ہیں جیسے کوئی اور کر سکتا ہے۔ لیکن عام شخص شاعر نہیں ہوتا۔ شاعر کے پاس پیغمبرانہ بصیرت ہوتی ہے اور وہ کسی واردات اور کسی تجربے کو حیطۂ اظہار میں لاکر کہاں سے کہاں پہنچادیتا ہے جناب ابو ظفر صہبا کے کلام کا مطالعہ اِسی روشنی میں کرنا چاہیے۔

غزلوں میں جدید رنگ کی تراکیب کا ظاہر ہونا اچنبھے کی بات نہیں۔ آخر جناب صہبا اِسی آب و ہوا میں برسہا برس سے سانس لے رہے ہیں۔ عصری حسّیت نے اُن سے اِس طرح کے تازہ شعر بھی کہلوائے ہیں:

اپنی ٹھنڈک سے جل رہا ہوں میں
برف بن کر پگھل رہا ہوں میں
ایک صورت بگڑتی جاتی ہے
ایک صورت میں ڈھل رہا ہوں میں

جناب صہبا کے اس شعر سے سادگی اور تقابل کا لطف اٹھائیے:

کوئی مجھ سا بھی تم نے دیکھا ہے
میں نے دیکھا نہیں کوئی تم سا
کہہ رہا ہوں بڑے یقین کے ساتھ
دو جہاں میں نہیں کوئی تم سا

کتاب کا سرِورق معروف افسانہ نگار محترمہ فردوس حیدر نے بنایا ہے، انھیں الگ سے "غزل" کے لیے کوئی پیکر تراشنے کی ضرورت نہیں پڑی، رنگوں کے امتزاج سے یہ شکل ابھاری ہے جو خود فنکاری کی ایک اچھی مثال کہی جاسکتی ہے۔

کتاب دیدہ زیب چھپی ہے، قابلِ مطالعہ ہے۔

(ا۔ س)

## اسرار خودی
## (فراموشدہ ایڈیشن)

ترتیب شائستہ خاں

صفحات ۱۳۴، قیمت = ۷۵/ روپے

مکتبہ جامعہ لیمٹڈ۔ نئی دہلی، بھارت

"اسرار خودی" فراموش شدہ ایڈیشن "۱۹۱۵ء کو محترمہ شائستہ خاں نے تلاش بسیار کے بعد دوبارہ جوں کے توں شائع کیا ہے۔ اِس کے ساتھ انھوں نے اپنا وہ مضمون آغازیہ کے طور پر شامل کرلیا ہے جو اب سے کئی سال پہلے "قومی زبان" نے شائع کیا تھا۔

میں نے "جوں کے توں" کے الفاظ اس لیے استعمال کیے ہیں کہ اِسرار خودی کے پہلے ایڈیشن (سنہ ۱۹۱۵ء) میں علامہ اقبال کی ایک منظوم پیشکش بہ حضور سر سید علی امام کا مکمل متن شامل ہے جو انیس اشعار پر مشتمل ہے اِسی کے ساتھ اسرار خودی کا دوسرا ایڈیشن بھی چھاپا گیا ہے جس میں سے پیشکش کے گیارہ شعر (نمبر چھ تا سولہ) خارج کر دیے گئے ہیں۔ اِس طرح یہ پیشکش کل آٹھ شعروں پر مشتمل رہ جاتی ہے۔ اب تو کئی سال سے یہ بھی شامل نہیں ہے۔ اور اس "پیشکش" کو سرے سے ہی حذف کر دیا گیا ہے، اس ردو بدل کے پیچھے جو مصلحتیں تھیں، یا ہو سکتی ہیں۔ انھیں کتاب کی مرتب محترمہ شائستہ خاں نے اپنے آغازیہ میں تفصیل سے زیر بحث لایا ہے۔

"اسرار خودی" کی من و عن ترتیب و اشاعت کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ طالبانِ علم تک اس کا ۱۹۱۵ء کا ایڈیشن اپنی اصل صورت میں آگیا ہے۔ جو نایاب حد تک کم یاب ہے۔

بہر حال اسرار خودی کا یہ ایڈیشن اب تاریخ کا ایک حصّہ ہے۔ اس کے کسی بھی اندراج یا حصّے کا یک قلم خارج کرنا تاریخ سے انکار کے مترادف ہے۔ یہ عجیب صورت حال ہے کہ اسرار خودی جو ہندوستان سے شائع ہوئی اس میں سر علی امام کے نام انتساب کے انیس کے انیس اشعار شامل ہیں اور پاکستان کی اسرارِ خودی سے اس کا ایک قلم اخراج ہو گیا ہے۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے۔

(ا۔ س)

قومی زبان ہر گھر کی ضرورت ہے

قومی زبان (۷۷) نومبر ۱۹۹۵ء

# کچھ وقت غیر ملکی اردو کتابوں کے ساتھ

ڈاکٹر انور سدید

## قدیم ہندوستان میں شودر / مصنّف: ڈاکٹر رام شرن شرما
## مترجم جمال محمد صدیقی

ڈاکٹر رام شرن شرما کی علمی اور تحقیقی کتاب "قدیم ہندوستان میں شودر" اس لیے اہم ہے کہ اس میں ایک خاص طبقے کے بارے میں جسے ہندوستانی سماجیات میں بے حد پست مقام دیا گیا تھا قدیم ترین اور بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہیں، اس کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ محقق نے اپنے عصری تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر شودروں کی تاریخ غیر جانبداری سے مرتب کرنے کی سعی کی ہے۔ اور کسی مقام پر بھی معروضیت کا زاویہ مدھم نہیں ہونے دیا اور جذباتیت کو کتاب میں شمولیت کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر آر، ایس شرما نے اپنا تحقیقی مقالہ "سکول آف اورینٹل سٹڈیز" لندن میں مکمل کیا جہاں انھیں بنیادی ماخذات تک رسائی کی سہولت حاصل تھی۔ چنانچہ جب وہ پٹنہ یونیورسٹی میں واپس آئے تو ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے سرفراز ہو چکے تھے۔ زیرِ نظر کتاب ان کی پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے منظورہ شدہ تحقیقات کے بیشتر، حصے پر مشتمل ہے۔ اس کا ترجمہ جمال محمد صدیق صاحب نے کیا ہے اور اسے ترقی اردو بورڈ نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

شودروں کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ طبقہ آریائی سماج سے تعلق نہیں رکھتا اور جب برہمنی سماج میں ذات پات کی تشکیل دی گئی تو شودروں کے لیے غیر آریائی آبادی کا انتخاب کیا گیا۔ بعد میں آریائی فاتحین نے نہ صرف ان کے پست سماجی مقام کو مستحکم کیا بلکہ ان سے غلاموں جیسا سلوک بھی کیا اور انھیں غیر پوتر یعنی ناپاک قرار دے دیا۔ ڈاکٹر شرما کی رائے میں اس نظریہ کو یورپ کے سفید فام باشندوں اور ایشیا اور افریقہ کے غیر سفید فام آبادیوں کے باہمی نزاع سے تقویت ملتی ہے۔ رگ وید کے متعدد منتر اتھر وید میں پائے جاتے ہیں۔ ان منتروں میں آریائی دیوتا اندر کا ظہور شودروں یا کم ذات طبقات کے فاتح کی حیثیت میں ہوتا ہے۔ اندر دیوتا نے داسوں کو محکوم بنانے کی مہم کا ذمہ لیا اور اسفل داس ورن کو جو ان شودروں میں حاکمانہ حیثیت رکھتا تھا غار میں قید کر دیا۔

ایک اور تصور یہ ہے کہ شودروں کی ایک کثیر تعداد ابتدا میں آریہ برادری کا حصہ تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئے فاتحین جب شمالی ہند کی سرزمین پر قبضہ کر لیتے تو شکست خوردہ عناصر کو اپنی اجتماعی ملکیت قرار دیتے اور ان سے سماجی خدمت کا کام لینے

لگتے۔ اس نظریے کے مطابق ابتدا میں شودروں کی ایک کثیر تعداد آریہ برادری کا جزو تھی اور انھیں بعض مذہبی حقوق بھی حاصل تھے لیکن ۶۰۰ سے ۳۰۰ ق م تک جب ورن سماج مکمل ہو گیا تو شودروں پر سیاسی، سماجی، معاشی، قانونی اور مذہبی بندشیں عائد کر دی گئیں ڈاکٹر شرما نے اس بحث سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شودر کی اصطلاح ایک ایسا اجتماعی نام تھا جو مختلف برادریوں کے کام کرنے والوں کو دیا گیا بعد میں شودروں کی غلامی نے مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔ اور انھیں نچلے درجے کے کام سونپ دیے گئے۔

منو نے شودروں کی برہمن دشمن سرگرمیوں کی جو مذمت پرانوں میں کی اور اس سے ورنوں کے درمیان شدید کشمکش کے مرحلہ کی نشاندہی ہوتی ہے یہ حالت گپت عہد تک جاری رہی لیکن اہم بات یہ ہے کہ نئی اور فنون نے ترقی کی تو محنت کش شودروں کی حیثیت میں تبدیلی کے آثار رونما ہونے لگے وہ جب برہمنوں اور کشتریوں کے مظالم سے تنگ آجاتے تو کسی دوسری جگہ نقل مکانی کر جاتے۔ اب برہمن نے ایک بنیادی ضرورت کے تحت اس طبقے کو شودروں اور اچھوتوں میں تقسیم کر دیا۔ شودروں کو اچھوتوں سے بلند کر دیا گیا اور اچھوتوں کو مزید نیچی حیثیت دے دی گئی۔ اوّل الذکر عمل کا فائدہ یہ ہوا کہ جب برہمنی نظام میں کمزوری کے آثار پیدا ہوئے تو جرتی اور بہادر شودر کشتری ذات میں ضم ہو گئے۔ اور اچھوت نیچ سے نیچ تر ہوتے چلے گئے۔ لیکن جب بودھ، جین، شیو اور وشنومت کو فروغ حاصل ہوا تو ان نچلی ذاتوں کو سماجی مساوات کے بجائے مذہبی مساوات کی امید دلائی گئی اس کے برعکس سماجی سطح پر شودروں کو خود اپنی حیثیت مستحکم کرنے کا موقع ملا۔ اور انھوں نے اس کا خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جو باہمی نفاق کی وجہ سے کامیاب نہ ہوئی۔

ڈاکٹر رام شرن شرما کی تحقیق کا زمانہ ۵۰۰ عیسوی تک ہے۔ انھوں نے شودروں کی قدیم تاریخ کو بعض اہم ماخذات سے تلاش کر کے روشن کر دیا ہے۔ شودروں کی تاریخ میں آئندہ ۱۵۰۰ برس یعنی ۱۹۹۵ء تک کے سال ابتدائی حالات و واقعات سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ بیسویں صدی میں مہاتما گاندھی نے انھیں معاشرتی مساوات اور بہتر مستقبل کا خواب دکھایا۔ ڈاکٹر امبیدکر کی مساعی سے اس گرے پڑے طبقے کو تعلیم کی سہولتیں اور ملازمتوں کے مواقع حاصل ہوئے اور اب سیاسی صورت یہ ہے کہ کانگریس اور بی جے پی آئندہ ۱۹۹۶ء کے انتخابات میں جنوبی ہند کے دلت باشندوں کا تعاون حاصل کرنے کی بھرپور سعی کر رہی ہے۔

تاریخ کا یہ حصہ بہت اہم ہے اور اس پر ڈاکٹر رام شرن شرما جیسے کسی محقق کو ہی کام کرنا چاہیے۔

اس کتاب سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی حکومت کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لیے کس طرح ہندوستان کی قدیم تاریخ، رسوم و رواج اور مذہبیات سے پوری آگہی حاصل کی اور پھر سماجی تنظیم کو اپنی مرضی کا رخ دے دیا۔

## جذبِ عشق ... اردو کی پہلی طبع زاد کہانی امرتبہ ڈاکٹر عبدالرؤف

"جذبِ عشق" سید حسین شاہ حقیقت کی نثری تصنیف ہے جو نواب آصف الدولہ کے دورِ حکومت کے اختتام یعنی ۹۷-۱۷۹۶ء میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس میں جو داستان بیان کی گئی ہے اس کا پیش منظر خالصتاً ہندوستانی ہے اور اس کا قصہ چونکہ مصنف نے اپنے ذہن سے تراشا ہے اس لیے یہ طبعزاد اور تخلیقی کہانی ہے۔

شاہ حسین حقیقت ایک نکتہ ور مصنف تھے، انھوں نے مختلف موضوعات پر آٹھ کتابیں لکھیں جن کے نام حسبِ ذیل ہیں:

(۱) خزینتہ الامثال (۲) صنم کدۂ چین (۳) دیوانِ ریختہ (۴) تحفتہ العجم (۵) ہفت نسخہ (۶) تذکرۂ احبا (۷) جذبِ عشق (۸) مثنوی ہشت گلزار۔

اردو کی ادبی تاریخ میں اٹھارویں صدی عیسوی کی آخری دہائی سے پہلے چونکہ یہاں کسی باقاعدہ نثری تصنیف کا سراغ نہیں ملتا اس لیے سید حسین شاہ حقیقت کی اس کتاب کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

"جذبِ عشق" کا ہیرو ایک جوان رعنا ہے جو مرہٹہ لشکر میں ملازم تھا۔ بندرابن میں بھوانی میلے میں اسے حسن کا ایک پیکر نظر آگیا جسے وہ پہلی نظر میں ہی دل دے بیٹھا۔ محبوبہ کے دل میں بھی اس نوجوان کی آتشِ عشق بھڑک اٹھی لیکن پھر سماجی رسوم و قیود رستے میں حائل ہو گئے۔ المیہ انجام یہ ہوا کہ دونوں نے تالاب میں ڈوب کر جان دے دی،

سید حسین شاہ حقیقت کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے "جذبِ عشق" میں داستان کے جذب و اثر کو بامو قع اشعار سے بڑھانے کی عمدہ کاوش کی ہے۔ انھوں نے مثنوی اور غزل سے بھی استفادہ کیا اور کہانی کی جمالیاتی لطافت کو شاعرانہ نثر سے بھی تقویت دی ہے۔

سید حسین شاہ حقیقت کے آباواجداد ۱۷۱۹ء میں خوست سے ہجرت کر کے لاہور آگئے تھے۔ ان کے بزرگوں کی علمی شہرت کا چرچا ہوا تو انھیں شاہ عالم کے دہلی دربار تک رسائی حاصل ہو گئی۔ پھر کچھ عرصہ انھوں نے بریلی میں سکونت اختیار کی اور آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ آگئے۔ ۷۳ - ۱۷۷۲ء میں حسین شاہ حقیقت بریلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دو بھائی سید حسن شاہ اور سید قاسم شاہ تھے۔ داستان نگاری سے اس خاندان کی وابستگی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ سید حسن شاہ نے دو سو برس قبل ایک ناول "قصۂ حسن و عشق" لکھا۔ جس کا فارسی سے اردو میں ترجمہ منشی سجاد حسین انجم کسنڈی نے "نشتر" کے نام سے کیا۔ اب انگریزی میں اس کا ترجمہ قرۃالعین حیدر نے "دی ناچ گرل" (THE NAUTCH GIRL) کے نام سے کیا ہے (تفصیل کے لیے ادب سہیل کا مقالہ "دو سو برس پہلے کا ناول "نشتر" مطبوعہ اوراق خاص نمبر جولائی ۱۹۹۴ء ملاحظہ کیجیے) ان کے خاندان کی یہ روایت ظفر عمر اور فضل قدیر سے ہوتی ہوئی الطاف فاطمہ اور نشاط فاطمہ تک پہنچ گئی ہے اور تاحال زندہ ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سید حسین شاہ حقیقت فطری شاعر ہی نہیں، فطری داستاں نویس بھی تھے اور اس فن میں ان کا جوہر تخلیقی اور اختراعی تھا۔

زیرِ نظر "جذبِ عشق" کا وہ نسخہ ہے جسے ڈاکٹر عبدالرؤف نے مرتب کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے آکسفورڈ کی بولڈن لائبریری اور ایشیاٹک لائبریری کے دو نسخوں تک رسائی حاصل کی اور پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب کے کتب خانے کے مخطوطوں سے بھی استفادہ کیا۔ "جذبِ عشق" مکتبہ محمدی کانپور سے ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا تھا لیکن اب نایاب تھا۔ ڈاکٹر عبدالرؤف نے نہ صرف متن کی تصحیح کی بلکہ سید حسین شاہ حقیقت کے آثار و احوال دریافت کرنے کی کاوش کی۔ محترم ڈاکٹر سید محمود الحسن صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی نے اس کا پیش لفظ خیال افروز انداز میں لکھا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرؤف کی اس ادبی خدمت کی داد دی جائے گی کہ انھوں نے نثر کی ایک گم شدہ کتاب دریافت کی اور سید حسین شاہ حقیقت کا مقام اردو کہانی میں متعین کیا۔

## ارمغانِ آزاد/مرتبہ ڈاکٹر ظہور الدین

جگن ناتھ آزاد اردو کے ان خوش قسمت ادیبوں میں سے ہیں جنھیں ہر دور میں ان کے شایانِ شان خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ زیرِ نظر کتاب "ارمغانِ آزاد" میں انھیں کشمیر کے ادیبوں نے ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے سراہا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کو ۱۹۸۶ء میں شاعری پر "غالب ایوارڈ" دیا گیا تھا۔ اس موقع پر انجمن ترقی اردو ہند کی جموں شاخ نے ریاست کی جملہ ادبی انجمنوں کے تعاون سے ایک تہنیتی جلسہ ۱۸ دسمبر ۱۹۸۷ کو ایک روزہ سیمینار کی صورت میں منعقد کیا۔ اس جلسے میں ڈاکٹر نصرت چودھری، ڈاکٹر خورشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر کوشلیا ہادی نے مقالات پڑھے۔ متعدد ارکان نے تقریریں کیں اور جلسے کے بعد زیرِ نظر کتاب چھاپنے کا پروگرام بنایا گیا تو کشمیر کے ادیبوں کو اس میں شرکت کی دعوتِ عام دی گئی، چنانچہ جناب غلام رسول نازکی، پروفیسر منظر اعظمی، ظفر معراج، ڈاکٹر تہمینہ اختر، راج کمار چندن، سکھ چین سنگھ، صوفی غلام محمد اور او، این کول کے علاوہ

متعدد اصحاب نے شرکت کی۔ اور جگن ناتھ آزاد کی زندگی، فکر اور فن کے تقریباً سب گوشوں پر روشنی ڈالی۔

یہ کتاب "آزاد انسائیکلو پیڈیا" ہے جگن ناتھ آزاد کے ساتھ راج کمار چندن کی ملاقات میں بہت سے چبھتے ہوئے سوالات دریافت کیے گئے ہیں اور جگن ناتھ آزاد نے ہر سوال کا جواب خوش دلی اور کشادہ نظری سے دیا۔ آزاد صاحب کی وضاحتیں ان کی شخصیت کے اسرار و رموز سمجھنے میں بہت معاونت کرتی ہیں۔

ڈاکٹر ظہور الدین نے یہ کتاب محنت اور محبت سے مرتب کی ہے۔ ملنے کا پتہ مرحوم میموریل لٹریری سوسائٹی نئی دہلی۔

## آوارگی کا آشنا/دلیپ سنگھ

دلیپ سنگھ پہلی ملاقات میں صرف چند لمحوں کے لیے سنجیدہ نظر آتے ہیں لیکن وہ جونہی لبِ گفتار کھولتے ہیں تو مزاح پھل جھڑیاں بکھیرنے لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مزاح اُن پر آسمان سے اتر رہا ہے۔ میں نے ان کا پہلا مضمون چند برس قبل "نیرنگ خیال" میں پڑھا تو بے پایاں خوشی ہوئی کہ اردو میں ایک ایسا مزاح نگار پیدا ہو گیا تھا جو "آرٹ بکوالڈ" بننے کا آرزو مند نہیں تھا بلکہ مزاح سے اپنی داخلی فطرت کا مسکراہٹوں سے اظہار کرنا چاہتا تھا میں اس عرصے میں دلیپ سنگھ کا مستقل قاری بن چکا تھا اور ان کے مضامین تلاش کر کے پڑھتا۔ چند لمحوں میں اپنی بوجھل طبیعت کو سبکسار کر لیتا۔

اظہر جاوید مدیر "تخلیق" کی وساطت سے مجھے ان کی کتاب "آوارگی کا آشنا" ملی تو میرے لیے یہ بات خبر کی حیثیت رکھتی تھی کہ دلیپ سنگھ نے سفر نامے کے میدان میں بھی قدم رکھ دیا تھا۔ اب میرا خیال تھا کہ انھوں نے بھی مروجہ طریق کے مطابق سفر نامے میں اپنی خیالی فتوحات کا تذکرہ زیادہ کیا ہوگا اور سفر نامے کو نسوانی حسن سے دیدہ زیب و دلفریب بنا دیا ہوگا۔ لیکن حیرت ہوئی کہ دلیپ سنگھ نے جو اسلوب تراشا ہے وہ خالصتاً ان کا اپنا ہے۔ اور وہ منظر سے اپنے فطری انداز میں معانقہ کرتے ہیں تو بے ساختہ مزاح پیدا ہو جاتا ہے۔

اس سفر نامے کا ظہور یوں ہوا کہ اردو کے معروف افسانہ نگار ہرچرن چاؤلہ نے دلیپ سنگھ کو اوسلو آنے کی دعوت دی، وہاں سے نصر ملک نے انھیں ڈنمارک بلا لیا۔ اس سفر میں انھیں دو ادبی جلسے بھگتانے پڑے۔ بہت سے ادیبوں سے ملاقاتوں کا محل پیدا ہو گیا اور پھر سفر نامہ بنتا چلا گیا۔ اس سفر نامے میں کیسی کیسی لطافتیں بکھری ہوئی ہیں ان کا اندازہ اس اقتباس سے لگا لیجیے لیکن یاد رکھیے کہ یہ ایک سکھ کا سفر نامہ ہے جو خود اپنے آپ پر ہنس سکتا ہے:

"ناروے آ رہا تھا تو میں نے اپنی بیوی سے پوچھا" وہاں سے تمھارے لیے کیا لاؤں؟" کہنے لگی "کوئی چھوٹی سی سجاوٹ کی چیز لے آنا۔ "میں نے کہا" یہ تمھیں چھوٹی چھوٹی چیزوں کا شوق کیوں ہے؟... میرے پانچ فٹ تین انچ کے قد کو بغور دیکھتی ہوئی بولی ...اگر چھوٹی چیزوں کا شوق نہ ہوتا تو تم سے شادی کیوں کرتی؟ اس قسم کی لطافتیں ہر صفحے پر بکھری ہوئی ہیں۔

**ازراہ کرم اپنے مضمون کی پُشت پر نام اور مکمل پتا تحریر کریں**

# گردوپیش

## ڈاکٹر طاہرہ نیّر کی انجمن میں آمد

۳ اکتوبر ۹۵ء کو نیپال سے آئی ہوئی مہمان ڈاکٹر طاہرہ نیر انجمن ترقی اردو پاکستان میں مدعو ہوئیں اُن کے ساتھ ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس نشست میں صدر انجمن جناب نورالحسن جعفری بھی موجود تھے۔

جناب امراؤ طارق (نائب معتمد اعزازی انجمن) نے تقریب کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر طاہرہ نیّر پچھلے دس سال سے کھٹمنڈو میں قیام کرتی ہیں۔ کھٹمنڈو کی جامعہ میں پاکستان کی طرف سے اُردو چیئر پر متمکن ہیں۔ ان کے پی ایچ ڈی کے مقالہ "اُردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار" کو جلد ہی انجمن کتابی صورت میں شائع کر رہی ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ ڈاکٹر طاہرہ آپ کے روبرو ہیں، وہ خود ہی اُردو کے حوالے سے وہاں کے حالات گوش گزار کریں گی۔"

ڈاکٹر طاہرہ نیّر نے کہا کہ نیپال میں اُردو کی خدمت اور ترویج کے بڑے مواقع ہیں۔ پچھتر فی صد اردو الفاظ نیپالی زبان میں استعمال ہوتے ہیں، خاص طور پر عدالتی زبان میں اِس کا استعمال بہت دیکھا جاتا ہے، عام لوگ اُردو اور پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔

ڈاکٹر حنیف فوق نے زبان کے آپسی اشتراک کی وساطت سے نیپالی گرامر کے بارے میں دریافت کیا۔ جواب میں ڈاکٹر نیّر نے کہا کہ اُردو اور نیپالی قواعد ایک جیسے ہیں نیپال میں فعل کا استعمال اُسی طرح ہوتا ہے جس طرح اُردو میں رائج ہے۔

ڈاکٹر طاہرہ نیر نے بتایا کہ پورا نیپال تین طرح کی آبادیوں میں تقسیم ہے، باہر کی آبادی، ترائی کی آبادی اور وادی کی آبادی، سرحدی علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی نسبتاً زیادہ ہے اور وہاں کی زبان اُردو ہے، ویسے کھٹمنڈو میں بھی اُردو کا چلن عام ہے۔

صدر نورالحسن جعفری نے دریافت کیا کہ نیپال میں مسلمانوں کی آبادی کیا ہوگی؟ اِس پر ڈاکٹر طاہرہ نیّر نے جواب دیا کہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق، سات فی صد بتائی جاتی ہے لیکن عام اندازے کے مطابق مسلمان بارہ فی صد ہیں۔

جناب رحمان نشاط نے دریافت کیا کہ نیپال کا اکیڈمک LEVEL کیا وہی ہے جو ہمارے ہاں ہے؟ جواباً ڈاکٹر نیّر نے کہا کہ بالکل ہماری طرح ہے، انھوں نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ نیپال میں چالیس زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور اُن میں سے آٹھ زبانیں سرکاری میڈیا کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر فوق نے کہا کہ "کچھ نیپالی زبان میں اُردو تخلیقاتِ نظم و نثر کے تراجم کی بابت بتائیے۔"

جواب میں ڈاکٹر طاہرہ نیر نے بتایا کہ اُنھوں نے خود اُردو افسانوں کے ترجمے نیپالی زبان میں کیے ہیں۔ اِس کے علاوہ انھوں

نے جناب صدیق سالک کے ناول "پریشر کوکر" کو نیپالی زبان میں منتقل کر کے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر طاہرہ نے ایک سوال کے جواب میں یہ بتایا کہ نیپال میں ادبی رسائل کی تعداد چار یا پانچ ہے۔ البتہ ہفتہ وار رسائل کثرت سے شائع ہوتے ہیں۔

دورانِ گفتگو ڈاکٹر طاہرہ نے یہ انکشاف کیا کہ انھوں نے حال ہی میں "نیپال اُردو ٹرسٹ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ اس کے ذریعے مستقبل میں اُردو کی ترقی و ترویج کا کام خاطر خواہ کیا جاسکے گا۔

جناب شہاب قدوائی نے پوچھا "اس سلسلے میں نیپالی حکومت کی طرف سے کوئی تعاون حاصل ہے؟ جواب میں ڈاکٹر طاہرہ نے کہا کہ ہم چونکہ نیپال میں پاکستانی چیئر پر کام کر رہے ہیں، اس لیے اس طرح کی کوئی درخواست وہاں کی حکومت سے نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی نے کہا۔ لیکن کناڈا وغیرہ میں تو اُردو زبان کی سرپرستی وہاں کی سرکار کی طرف سے کی جاتی ہے۔ اِس پر ڈاکٹر طاہرہ نے کہا۔ "ابھی نیپال میں ایسی صورت پیدا نہیں ہوسکی ہے۔"

صدر نورالحسن جعفری نے استفسار کیا کہ کھٹمنڈو کی جامعہ میں اُردو طلبہ کی تعداد کیا ہوگی؟ اِس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر طاہرہ نیر نے کہا کہ "اکیڈمک کورسز" میں چھ طلبہ ہیں اور "لنگویج کورسز" میں بارہ طلبہ۔

صدر انجمن نورالحسن جعفری نے ڈاکٹر طاہرہ نیر سے پوچھا کہ نیپال میں اُردو کے فروغ کی مساعی میں انجمن کس طرح آپ کی مدد کرسکتی ہے؟ پھر خود ہی اُنھوں نے ایک تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ بیس پچیس صفحات کا رسالہ ہر سہ ماہ بعد یا جیسے آپ مناسب سمجھیں مرتب کریں، اِس طرح اِس کے سال میں تین یا چار ایڈیشن ہوں گے۔ انجمن ترقی اُردو اِس کی کتابت وطباعت کے جملہ اخراجات برداشت کرے گی۔

ڈاکٹر طاہرہ نیر نے اِس تجویز کا نہ صرف خیر مقدم کیا بلکہ مجوزہ پرچے کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے تیار ہوگئیں۔

بعدازاں ڈاکٹر طاہرہ نیر نے نیپالی نظم کے اُردو ترجمے پڑھ کر سنائے۔ گزشتہ مہینوں میں ڈاکٹر طاہرہ نیر کے دو نیپالی افسانوں کے ترجمے "قومی زبان" میں شائع ہوئے ہیں۔ ایک رمیش وکل کا افسانہ "بِترے کی اماں" ہے، دوسرا افسانہ ڈاکٹر دھرب چند گوتم کا "وہ کہاں تھا" ہے۔

اِس نشست کے دوسرے شرکاء میں، محترمہ فردوس حیدر، جناب نسیم باغپتی، محترمہ عائشہ نگہت اور شہزاد منظر تھے۔

## ممتاز افسانہ و ناول نگار شوکت صدیقی کے ساتھ ایک شام!

۱۰ اکتوبر ۹۵ء کو پبلی کیشن کمیٹی آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کے زیراہتمام جناب شوکت صدیقی کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ نظامت کے فرائض پروفیسر سحر انصاری نے انجام دیے۔ ابتدا میں پروفیسر سحر انصاری نے اُن کی شخصی زندگی اور تخلیقی کارناموں کا تعارف کرایا۔ اِس کے بعد اُنھوں نے شوکت صدیقی صاحب سے سوالات کیے۔ جواب میں جناب شوکت صدیقی نے مختصراً بتایا کہ انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں افسانہ نگاری کی ابتدا کی۔ پھر پاکستان میں ہجرت کے بعد وہ جس کس مپرسی کے دور سے گزرے اُس کا حال احوال سنایا۔ درمیان میں برسبیل تذکرہ افسانوں کے قلیل معاوضے کا ذکر آیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کے بارے میں بتایا جس میں اُردو اور انگریزی اخبارات کی ملازمت شامل ہے۔ سامعین کے سوالات کے بھی شوکت صاحب نے بڑے تحمل سے جوابات دیے۔ ایک پبلشر نے سوال کیا کہ اب قاری کم کیوں ہوگئے ہیں اور لائبریریوں کی جگہ وڈیو شاپ نے لے لی ہے؟ اس سوال کے جواب میں شوکت صاحب نے کہا کہ مجھے کبھی بھی اپنے قارئین سے شکایت نہیں

رہی۔ میرے ناول "خدا کی بستی" کی اشاعت تیرہ چودہ بار ہوچکی ہے اِسی طرح جانگلوس جلد اول، دوم اور سوم کی اشاعتیں بھی بالترتیب چوتھی اور تیسری بار ہوچکی ہیں۔

تقریب کے اختتام پر جناب یاور مہدی نے آرٹس کونسل پبلی کیشن کمیٹی کی جانب سے شیلڈ کی صورت میں نشان سپاس پیش کیا اور جناب ہادی نقوی نے پھولوں کے گلدستہ سے نوازا۔

اس موقع پر خواتین و حضرات کی ایک بڑی تعداد جلسہ گاہ میں موجود تھی، جس میں صاحبانِ ذوق کے علاوہ کراچی یونیورسٹی اور کالجوں کے پروفیسر حضرات شامل تھے۔

آخر میں تقریب کے شرکاء کی تواضع مشروب سے کی گئی۔

## آئرش شاعر نے نوبیل انعام برائے ادب (۱۹۹۵ء) حاصل کرلیا

آئرش شاعر اور مضمون نگار شاموس ہینے (Seamus Heaney) نے نوبیل انعام برائے ادب (۱۹۹۵ء) حاصل کرلیا ہے۔ سوئیڈش اکادمی ادبیات نے جمعرات ۵ اکتوبر کو یہ اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اُنہیں یہ انعام اُن کی شاعری کے غنائی حُسن اور اخلاقی عُمق کے اعتراف میں دیا گیا ہے۔

اکادمی کے اعلان کے مطابق شمالی آئرلینڈ میں پیدا ہونے والے مگر ڈبلن (جمہوریہ آئرلینڈ) میں مقیم ہینے کو ایک ملین ڈالر کا انعام اُن کے اُن کاموں کے صلے میں عطا کیا گیا ہے جو کرشماتِ روزمرہ اور زندہ ماضی کو اُجاگر کرتے ہیں۔

لندن میں ہینے کے ناشر نے بتایا کہ وہ ان دنوں یونان میں چھٹیاں گزار رہے ہیں اور شاید اُنھیں اِس بات کا علم نہیں کہ اُنھیں نوبیل انعام دینے کا اعلان ہوچکا ہے۔ ناشر فیبر اینڈ فیبر کے ترجمان کے مطابق اُنھیں توقع ہے کہ یہ خبر سُن کر ہینے اُن سے رابطہ کریں گے۔

ہینے دنیا کا مشہور ترین ادبی اعزاز حاصل کرنے والے تیسرے آئرش ہیں، اُن سے قبل ولیم بٹلر ییٹس نے ۱۹۲۳ء میں اور شاموئیل (سیموئیل) بیکیٹ نے ۱۹۶۹ء میں یہ اعزاز حاصل کیا۔ ہینے نے ۱۹۷۲ء میں شمالی آئرلینڈ چھوڑ کر جمہوریہ آئرلینڈ میں سکونت اختیار کی اور وہ گزشتہ بیس سال سے ڈبلن میں مقیم ہیں۔ (دل چسپ بات یہ ہے کہ ٹرینی داد کے ڈیرک والکوٹ، اِس سے قبل نوبیل انعام پانے والے آخری شاعر (۱۹۹۲ء) تھے۔ دو سال یہ اعزاز نثر نگاروں نے حاصل کیے۔)

ہینے اس لحاظ سے شعراء میں ممتاز ہیں کہ انھوں نے اپنی بُسٹ سیلر کتب کی اشاعت پر ناقدین سے خراج تحسین وصول کیا۔ ایک موقع پر اُنھیں ڈبلن کی مرکزی شاہراہ پر آٹوگراف لینے والوں سے فارغ ہونے میں تین گھنٹے لگے تھے۔

۵۶ سالہ ادیب دسمبر میں اسٹاک ہوم میں منعقد ہونے والی ایک شاندار تقریب میں اپنا انعام وصول کریں گے۔ گزشتہ سال یہ انعام جاپانی ناول نگار کیزابورواو (Kenzaburo Oe) نے حاصل کیا تھا۔

سوئیڈش اکادمی کے بیان کے مطابق ہینے نے، (جو موس بون، کاؤنٹی ڈیری (شمالی آئرلینڈ) میں ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے تھے،) اپنے مضامین میں یہ تجزیہ کیا ہے کہ "شاعر کا کام حُسن و جمال کے بقاء کو یقینی بنانا ہے، خاص طور پر جب ظالم حکومتیں اِسے تباہ کرنے کے درپے ہوں۔"

## ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے اعزاز میں تقریب

پاکستان نیشنل اکیڈمی کی جانب سے گزشتہ ہفتے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں معروف اسکالر غلام مصطفیٰ خاں کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا گیا جس میں سابق چیف الیکشن کمشنر جسٹس (ریٹائرڈ) نعیم الدین نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی جب کہ معروف دانشوروں ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک، ڈاکٹر اسلم فرخی اور ڈاکٹر انجم الاسلام نے مقالات پڑھے ڈاکٹر ارشاد الحق قدوسی نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا اس موقع پر افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے اکیڈمی کے اعزازی چیئرمین ڈاکٹر خاور جمیل نے کہا کہ علم وادب کے فروغ میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی ڈاکٹر انجم الاسلام نے اپنے مقالے میں بتایا کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان تقریباً ۷۰ کتابوں کے مصنف ہیں جو آئندہ لکھنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے کہا کہ علمی اور ادبی خدمات کے علاوہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے روحانی فیض سے بھی اہلِ وطن مستفید ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک نے جو اس محفل میں شرکت کے لیے خاص طور پر لاہور سے آئے تھے اپنے خطاب میں بتایا کہ میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا شاگرد اور مرید ہوں انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کے پائے کی ہستیاں اب معاشرے سے ناپید ہوتی جا رہی ہیں اس موقع پر اپنے خطاب میں ڈاکٹر مصطفیٰ خاں نے اہلِ وطن کو تلقین کی کہ اسلام اور پاکستان کے مفاد کو ہر چیز پر مقدم رکھیں انھوں نے معاشرے کی موجودہ حالت پر اظہار افسوس کیا اور کہا کہ اتحاد اور قربِ الٰہی سے ان مصائب پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ معروف افسانہ نگار اور اکیڈمی کے سیکرٹری نذر الحسن صدیقی نے کلماتِ تشکر پیش کیے تقریب کی نظامت ممتاز ادیب اور کالم نویس ایس ایم معین قریشی نے کی اور اس میں بڑی تعداد میں اہلِ قلم حضرات، دانشوروں اور عمائدین نے شرکت کی۔

## مری لٹریری سرکل

مری لٹریری سرکل نے گزشتہ دنوں جواد جعفری جو ڈائریکٹر کشمیر اکیڈمی ہیں اُن کے ساتھ ایک شام کا اہتمام کیا گیا۔ اِس میں اُن کی مشہور کتاب "احتجاج" پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ پروگرام کا آغاز تلاوت کریم سے ہوا۔ نظامت کے فرائض احمد زمان نے سر انجام دیے۔ - پروگرام کے مہمان خصوصی سلیم شوالوی (نمائندہ جنگ) تھے۔ جو مری لٹریری سرکل کے صدر بھی ہیں۔ کلمات تحسین پیش کرنے والوں میں عبدالرزاق اور مسلم کانفرنس تحصیل مری، لطیف کاشمیری چیئرمین مری لٹریری سرکل، جمیل یوسف، احمد زمان شامل تھے۔ لطیف کاشمیری نے کہا جواد جعفری کی زیر نظر کتاب "احتجاج" میں سرزمین کشمیر کے بارے میں مجاہدانہ احتجاج کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ سلیم شوالوی نے کہا جواد جعفری ایک شعلہ بیان خطیب، فکر انگیز ادیب اور دلگداز شاعر ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ درجہ کے منتظم اور عالم دین بھی ہیں۔ ان کی شگفتہ بیانیاں اور سخن طرازیاں کشمیر کی علمی ادبی سرزمین کو سیراب کیے ہوئے ہیں۔ احمد زمان نے کہا "احتجاج" میں کشمیر کے سلسلے میں لکھی گئی خوبصورت نظمیں نہ صرف حریتِ فکر کی علمبردار ہیں بلکہ انسانی حقوق کی بھی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ بعدازاں جواد جعفری نے اپنی کتاب "احتجاج" میں سے چند منتخب کلام حاضرین کو سُنا کر محفوظ کیا۔

## ڈاکٹر عبدالصمد انصاری کی یاد میں

ڈاکٹر عبدالصمد انصاری کی یاد میں دائرہ علم وادب پاکستان کراچی کے زیر اہتمام ایک اجلاس منعقد ہوا۔ پروفیسر ڈاکٹر خورشید

خاور امروہوی نے صدارت کی۔ سید معراج جامی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر خورشید خاور، ڈاکٹر وفا راشدی، شفیق الدین شارق ذکی دہلوی، ظہیر مشرقی، عشرت رومانی، معراج جامی اور مرزا نسیم بیگ نے ڈاکٹر عبدالصمد انصاری کی شخصیت اور علمی تعلیمی ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر ضیاء اللہ ضیاء نے ڈاکٹر انصاری کی وفات پر منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

## ایک نثری نشست

گزشتہ دنوں "دبستان حرا" کراچی کی ایک ماہانہ نثری نشست شادمان ٹاؤن نارتھ کراچی میں زیر صدارت ایڈوکیٹ اور معروف شاعر مسلم شمیم منعقد ہوئی تلاوتِ کلام پاک کی سعادت سید عبدالقیوم چواروی نے حاصل کی جبکہ نظامت کے فرائض راقم الحروف نے انجام دیے۔ معروف افسانہ نگار جناب علی حیدر ملک نے اپنا مضمون بعنوان "ایک اطالوی ناول کا تعارف" پیش کیا۔ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے شاہین بدر نے کہا کہ یہ مشہور ناول نگار خاتون اُوریانہ فلاسی کے ناول کا ترجمہ ہے جس کا انھوں نے تجزیہ پیش کیا ہے۔ اقبال مجیدی نے کہا اِس ناول میں بہت سے سوالات اٹھائے گئے ہیں۔

کلیم رحمانی نے کہا اِس مضمون میں ناول نگار نے زندگی کے حوالے سے عدم مساوات کا ذکر کیا ہے۔ اس ناول کو سمجھنے کے لیے حیدر صاحب کے مضمون کا مطالعہ کافی ہوگا۔ یہ ناول خود کلامی کے انداز میں لکھا گیا ہے اس میں زندگی اور معاشرے میں پھیلی ہوئی ناانصافیوں کے بارے میں بہت سے سوالات اٹھائے گئے ہیں۔

پروفیسر محمد عثمان رمز نے کہا۔ علی حیدر ملک نے مواد اور ہیئت دونوں لحاظ سے اس ناول کے بارے میں گفتگو کی ہے اور جو فلش پوائنٹ ملے ہیں اُنھیں بڑے موثر انداز میں اُجاگر کر دیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ جو آدمی سوالات کے کرب سے نہیں گزرتا، وہ ادھورا ہوتا ہے مغربی ممالک میں اقدار کی جو پامالی ہوئی ہے اُس کا تمام اہل قلم نے اظہار کیا ہے اس میں جو سوالات اٹھائے گئے ہیں ان کو سامنے رکھ کر ہم غور کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہم اپنے ضمیر کے سامنے اس لیے جوابدہ ہیں کہ اُن کے جوابات کے ذریعہ ہی ہم معاشرے کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

صدر نشیں مسلم شمیم نے کہا۔ مغربی ادبیات میں جو رجحانات پائے جاتے ہیں اُس سے مترجم نے ہمیں روشناس کرایا ہے اور علی حیدر ملک نے اُس کا نہایت موثر تعارف کر دیا ہے۔ اوریانہ فلاسی کی تخلیق کا مطالعہ ایک تخلیق کار نے کیا ہے اور اس کرب کو محسوس کیا ہے جس سے مصنفہ دوچار تھی اور انھوں نے اس ناول کے فکری دھارے کو دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی یہ کوشش قابل ستائش ہے۔

(رپورٹ: احمد زین الدین)

## شکاگو میں اعزازی تقریب اور مشاعرہ

انجمن طلبہ قدیم جامعہ عثمانیہ شکاگو دی عثمانینس یو۔ ایس۔ اے (The Osmanian U.S.A) کے زیر اہتمام ایک خصوصی اعزازی تقریب اور مشاعرہ کا انعقاد ۹ ستمبر ۹۵ء کو سی ای ایس اے لمبارڈ۔ الی ناٹے میں بڑے تزک و احتشام سے ہوا۔

اعزازی تقریب کے انعقاد کا مقصد عثمانیہ یونیورسٹی کی منتخب شخصیتوں کو اُن کی اعلیٰ خدمات و کارکردگی کی بنیاد پر انجمن کی جانب سے اعزازات تفویض کرنا تھا۔ انجمن کے سرپرستوں اور کارکنوں نے محسوس کیا بعد از مرگ تو ایوارڈ تو کسی کو کبھی

بھی دیے جاسکتے ہیں لیکن منتخب اور نمایاں شخصیات کو ان کی زندگی میں ہی ایوارڈز دے کر اُن کے کارناموں کو عوام وخواص کے سامنے پیش کرنا ایک برمحل و بروقت عمل ہے۔

یہ سلسلہ اعترافِ خدمات دوسری ادبی انجمنوں کے لیے بھی رہنما ثابت ہوسکتا۔

وہ مہمانانِ گرامی جنھیں اعزازات کے لیے منتخب کیا گیا تھا اُن میں ڈاکٹر احمد اللہ خاں، پروفیسر شعبۂ قانون جامعہ عثمانیہ و ڈائرکٹر دائرۃ المعارف حیدرآباد اور صحافی جے وی لکشمنا راؤ ایوشٹ ایڈیٹر انڈیا ٹری بھول شکاگو تھے۔ پروگرام کے مطابق تقسیم اعزازات وانعامات کی تقریب کے صدارت جناب ہاشم علی اختر سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی و علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے فرمائی۔ ابتدا میں جناب خلیل الزماں خاں صدر انجمن طلبہ قدیم جامعہ عثمانیہ نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے انجمن کے مقاصد اور کارکردگی پر روشنی ڈالی، ڈاکٹر توفیق انصاری احمد نے ڈاکٹر احمد اللہ خاں کی شخصیت اور کارناموں پر ایک جامع مضمون پیش کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر احمد اللہ خان کی کتاب "لیگل گائیڈنس" کی صدر جناب ہاشم علی اختر کے ہاتھوں رسم اجرا ہوئی۔ انھوں نے انجمن کی جانب سے، ڈاکٹر احمد اللہ خاں کی گلپوشی کرتے ہوئے ان کو شال اُڑھا کر "آفتاب قانون ومذہب" کا خصوصی اعزاز عطا فرمایا۔ ڈاکٹر احمد اللہ نے اظہار تشکر کیا اور کہا کہ انجمن کی اس تقریب میں آکر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے ملک، اپنے وطن اور اپنے لوگوں میں کھڑے ہیں۔

ڈاکٹر احمد اللہ خاں کے بعد ڈاکٹر توفیق انصاری احمد نے جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل اور ارض دکن کے ممتاز صحافی جے۔ وی لکشمنا راؤ کو خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے ان کی صحافتی خدمات کو اُجاگر کرتے ہوئے جے وی راؤ کو دکنی صحافت کی عمارت کا ستون قرار دیا۔ صدر تقریب جناب ہاشم علی اختر نے جے وی راؤ کی گلپوشی کی اور انجمن کی جانب سے شال اُڑھا کر "دکنی جرنلسٹ" کا خصوصی اعزاز عطا فرمایا۔ جے وی راؤ نے بادیدۂ نم کہا کہ آج کا دن میری زندگی کا ایک اہم دن ہے۔ مجھے یہاں جس طرح کا خلوص ملا، جس طرح میری پذیرائی کی گئی اس کا اظہار مشکل ہے۔

اُنھوں نے اپنی پتنی کے بارے میں کہا اگر صحافت کے میدان میں وہ ہر قدم پر میرے ساتھ نہ ہوتی تو یہ کڑا سفر طے کرنا مشکل ہوجاتا۔

صدر جلسہ جناب ہاشم علی اختر نے تقریب کو سمیٹتے ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی کی یادوں کو تازہ کیا اور کہا۔ ڈاکٹر احمد اللہ خاں کا شمار کسی بات کو سُرعت سے سوچ کر اُس پر متوازن طریقے پر عمل کرنے والوں میں ہوتا ہے۔ جے۔ وی لکشمنا راؤ کے تعلق سے کہا کہ وہ ایک نڈر، بے باک اور حقیقت پسند صحافی ہیں صدارتی تقریر کے بعد عشائیے کے اعلان کے ساتھ ہی تقریب کا یہ حصہ اختتام کو پہنچا۔

عشائیہ کے فوراً بعد، اعزازی تقریب کے دوسرے دور میں نمائندہ رکن جناب حسن چشتی کی صدارت اور ڈاکٹر احمد اللہ خاں، مہمان خصوصی کی موجودگی میں مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ مشاعرہ کے آغاز سے پہلے صدر مشاعرہ جناب حسن چشتی نے صدارتی خطبہ میں انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ شکاگو۔ ای نائے "دی عثمانینس۔ یو ایس اے" کی دیرینہ کارکردگی کو سراہا۔ انجمن کے ذمہ داروں کو اُن کی ادبی سرگرمیوں اور معیاری ادبی خدمتوں پر مبارک باد پیش کی اور توقع ظاہر کی کہ مستقبل میں اس بے لوث خدمت کا دائرہ عمل اور بھی وسیع ہوگا۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ انجمن ارض دکن سے محبت رکھنے والی وہ فعال انجمن ہے جو دیار غیر میں دکن کا نام روشن کررہی ہے۔ مشاعرہ کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر توفیق انصاری احمد نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ روایاتی مشاعرہ میں جن منتخب شعراء نے کلام سنایا اُن میں حامد امروہوی، نعمت اللہ، ڈاکٹر خورشید خضر، سید نصرت، لطیف سید سیف،

کلپنا سنگھ چٹنس، واصف مُولجی، رشید شیخ، غوثیہ سلطانہ، مخفی امروہوی، ڈاکٹر یوسف اعظمی، ڈاکٹر توفیق انصاری احمد، نسیمہ کلثوم نسیم، زاہد رضوی، مظفر احمد ضیاء، شاعر دکن نیاز گلبرگوی اور صدر مشاعرہ نمائندہ دکن جناب حسن چشتی شامل ہیں۔

مشاعرہ کے اختتام پر میر حامد علی خاں نے انجمن کی جانب سے شرکاء سامعین و معززین کا شکریہ ادا کیا۔ اعزازی تقریب و روایاتی مشاعرہ میں علمبردار آصفجاہی جناب آصف علی ہاشمی اور دکنی محقق نواب نورالدین خاں کے علاوہ مقامی معززین اور صحافتی نمائندوں کی کثیر تعداد نے شرکت فرمائی۔ "اور دکنی اعزازات و روایات" کی یہ ملی جلی یادگار شام رات دیر گئے اختتام کو پہنچی۔

(رپورٹ: توفیق انصاری احمد، امریکہ)

## بنگلہ دیش کے معروف شاعر حافظ دہلوی کا انتقال

جنگ کراچی ۲۹ اگست ۱۹۹۵ء بنگلہ دیش کے معروف بزرگ اُردو شاعر جناب حافظ دہلوی کا ۲۷ اگست کو انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۵ سال تھی۔ ان کا انتقال فالج کی وجہ سے ہوا۔ ادارہ قومی زبان اُن کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

(روزنامہ جنگ)

## اختر لکھنوی کا انتقال

ریڈیو پاکستان کراچی کے سابق نیوز کاسٹر اور پروڈیوسر ممتاز شاعر اختر لکھنوی طویل علالت کے بعد ۶۰ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ان کا جنازہ ایم۔ ۱۲۴۳ محمد مصطفیٰ کالونی سیکٹر ساڑھے گیارہ اورنگی ٹاؤن سے اُٹھایا جائے گا۔

(جنگ ۲۸ ستمبر ۹۵ء)

## ڈاکٹر صابر آفاقی کے اعزاز میں مشاعرہ

ملک کے معروف شاعر و ادیب محقق پروفیسر ڈاکٹر صابر آفاقی متحدہ عرب امارات کے علمی دورے پر ابوظہبی پہنچے تو ان کے اعزاز میں ایک مقامی ہوٹل میں ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ایک درجن سے زیادہ شعراء نے حصہ لیا۔

آزاد کشمیر کے نامور ادیب محمد کبیر خاں جو "ہمہ یاران دشت"، "آزاد کشمیر کا تاریک جغرافیہ" اور "چاند چہرے" جیسی اہم کتابوں کے مصنف ہیں۔ ایک مدت سے ابوظہبی میں مقیم ہیں اور اردو کی ترقی کے لیے مقدور بھر کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یہ مشاعرہ بھی محمد کبیر خاں اور شفیق سلیمی کے اہتمام سے منعقد ہوا۔ اس محفل مشاعرہ میں جن شعرا نے کلام سنا کر سامعین کو محظوظ کیا ان کے اسمائے گرامی ہیں۔

سعدیہ روشن، ظہور الاسلام جاوید، شفیق سلیمی، حسن اللہ ہما، تسنیم عابدی، تنہا یوسفی، خورشید خاں خورشید، مرید حسین مرید، اختر عابدی، محمد بشیر راہی، مشاعرہ کے اختتام پذیر ہونے پر مہمانوں کو عشائیہ دیا گیا دوسرے دن ریڈیو ابوظہبی کے شعبۂ اردو کے انچارج جناب قمر سلیمان نے ڈاکٹر صابر آفاقی صاحب سے مفصل انٹرویو لیا اور متعدد غزلیں ریکارڈ کیں۔

(رپورٹ: ر۔ حسینی)

## "مقتدرہ کے شائع کردہ تھیسارس کی تقریب رونمائی"

مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام "اردو تھیسارس" کی تقریب رونمائی لاہور کے ایک مقامی ہوٹل میں منعقد ہوئی جس کی صدارت قومی کمیشن برائے تاریخ و ثقافت اور اکادمی ادبیات کے چیئرمین فخر زمان نے کی۔ مہمان خصوصی پنجاب اسمبلی کے اسپیکر محمد حنیف رامے تھے جبکہ ڈاکٹر سلیم اختر، پروفیسر رضی عابدی، ظفر اقبال اور ڈاکٹر وحید قریشی نے "اردو تھیسارس کے حوالے سے مقالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے ادا کیے۔ سب سے پہلے مقتدرہ کے صدر نشین افتخار عارف نے ابتدائیہ پیش کیا جس میں مقتدرہ قومی زبان کی کارکردگی کے مختصر جائزے کے ساتھ ساتھ اس کے اہم منصوبوں پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ اُنھوں نے کہا کہ ۱۹۹۷ء میں پاکستان کے پچاس سالہ جشن کے موقع پر مقتدرہ دنیا کی پچاس عظیم کتابوں کے اردو تراجم پیش کر رہا ہے۔ تھیسارس کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ یہ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو اردو میں لکھنے پڑھنے والوں اور مترجمین کے لیے بنیادی اہمیت و افادیت کی حامل ہے۔ انھوں نے بتایا کہ رفیق خاور مرحوم نے انتہائی کاوش اور محنت کے ساتھ یہ لغت مرتب کیا تھا جو الفاظ کے وسیع تر مترادفات و متضادات تلاش کرنے اور مختلف معانی یا کسی تصور کے لیے نئے الفاظ سامنے لانے میں مدد و معاون ثبت ہوگا۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے "گنجینۂ معنی کا طلسم" کے عنوان سے لکھے گئے اپنے مقالے میں بتایا کہ مقتدرہ نے اپنے قیام سے لے کر اب تک بہت سی اہم کتابیں شائع کی ہیں جن میں سے ایک "اردو تھیسارس" بھی ہے۔ انھوں نے تھیسارس کے استعمال سے متعلق انکشافات کرتے ہوئے بتایا کہ اس میں لفظ کے معنی عام لغت کی مانند نہیں دیکھے جاتے بلکہ اس کے لیے جداگانہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے اور جب یہ اصول ایک بار سمجھ لیا جائے تو پھر تھیسارس "کھل جا سم سم" میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

پروفیسر رضی عابدی نے انگریزی کے راجٹ تھیسارس کے حوالے سے اپنے مضمون کا آغاز کیا اور کہا کہ زبان کے ذریعے تجربہ و علم ایک شخص سے دوسرے شخص تک اور ایک دور سے دوسرے دور تک منتقل ہوتے رہتے ہیں اسی لیے زبان کو تہذیب کی


قدیم شعرا، محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کے کلام کا جامع انتخاب اور تعارف

# غزل نما

جس کو محترمہ ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور مطالعے کے بعد ترتیب دیا

طلبہ اور ریسرچ اسکالر دونوں اس سے مستفید ہو سکتے ہیں

قیمت =/۱۰۰ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹- بلاک (۷)، گلشن اقبال کراچی- ۷۵۳۰۰

گزشتہ سے پیوستہ

# نئے خزانے

ڈاکٹر وفا راشدی

## شاہ ولی اللہ

ابو سلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر — علوم و افادات ولی اللہ کی تدوین ..... — الولی، حیدر آباد سندھ مئی جون ۹۴ء ص ۱۵

عبید اللہ سندھی، مولانا — اسلام کے عالمگیر انقلابی پروگرام کی تاریخ اور ..... — الولی، حیدر آباد اگست ستمبر ۹۴ء ص ۱۰۸

عبید اللہ سندھی، مولانا — دار العلوم دیوبند میں حکمت الامام ولی اللہ ..... — الولی، حیدر آباد اگست ستمبر ۹۴ء ص ۱۱۴

عبید اللہ سندھی، مولانا — محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج اور ..... — الولی، حیدر آباد اگست ستمبر ۹۴ء ص ۱۱۶

اردو ترجمہ: ثناء اللہ سومرو — شاہ ولی اللہ اور اسلامی حدود — فکر و نظر اسلام آباد اکتوبر دسمبر ۹۴ء ص ۵۹

محمد امین، ڈاکٹر — حکمتِ ربانیہ پر شاہ ولی اللہ کا تصنیف الخیر الکثیر — الولی، حیدر آباد سندھ جولائی ۹۴ء ص ۲۴

محمد سرور

## غالبیات

آسی ضیائی، پروفیسر — غالب اور رشید احمد صدیقی — سیارہ، لاہور دسمبر ۹۴ء ص ۵۲

ابوالکلام قاسمی — غالب کے خطوط میں اظہارِ ذات — اوراق، لاہور جولائی اگست ۹۴ء ص ۹۹

ا۔ ز لکھنوی — غالب مغفور — خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۵

اقبال انصاری — غالب کی اردو فارسی شاعری — خدا بخش جرنل پٹنہ ۸۷-۸۰/۹۲ء ص ۲۵

اکبر حیدری کاشمیری، پروفیسر — مرزا غالب کی بے اعتدالی — خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۱۱۵

امتیاز علی عرشی مرحوم — دیوانِ غالب، نسخہ آصفیہ مطبوعہ ۱۸۶۲ء ..... — نقوش، لاہور ۱۳۹/۹۴ء ص ۱۶۴

امیر امام حر — مجلسِ یادگارِ غالب کا شائع کردہ دیوانِ غالب — صحیفہ لاہور جولائی ستمبر ۹۳ء ص ۵

جاوید طفیل — غالب اور ان کا عہد — طلوع افکار، کراچی اگست ستمبر ۹۴ء ص ۲۷

جگیشور ناتھ ورما — دیوانِ غالب بخطِ غالب روداد اشاعت — نقوش، لاہور ۱۳۹/۹۴ء ص ۹۴۵

— فلسفۂ غالب — خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۳۱

| | | |
|---|---|---|
| حامد علی شاہ | عمدگی کلامِ غالب، سائنس کی روشنی میں | سائنسی ادب، کراچی اگست ۹۴ء ص ۸۰ |
| ذکاء صدیقی | اپنے کلام پر غالب کی کچھ اصلاحیں | صحیفہ، لاہور جنوری مارچ ۹۴ء ص ۲۸ |
| ریاض راہی | مرزا غالب کی المیہ شاعری | حریر کراچی سالنامہ جولائی ۹۴ء ص ۷۳ |
| سلیم جعفر | انتخابِ دیوانِ غالب | خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۱۲۲ |
| طالب کاشمیری | مرزا غالب اور دیگر شعراء | خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۴۸ |
| عاشق علی | غالب کا مذہب | خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۱۰۰ |
| علی عباس حسینی | غالب اور ڈاکٹر سید عبداللطیف | خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۸۶ |
| محمد حسین فطرت | غالب کا مذاق اجتہاد | معارف اعظم گڑھ اکتوبر ۹۴ء ص ۳۰۲ |
| مسیح الدین عثمانی | جے پور میں سلسلۂ تلامذہ غالب (گزشتہ سے پیوستہ) | الشاء، حیدر آباد ۹۴/۴ء ص ۵۷ |
| مشکور حسین یاد | غالب کا ایک شعر | فنون، لاہور مئی اکتوبر ۹۴ء ص ۵۵ |
| معین الرحمن، ڈاکٹر | غالب کے تین نئے خط | قومی زبان کراچی اگست ۹۴ء ص ۷۳ |
| مقبول حسن احمد پوری | براؤننگ اور غالب | خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۶۲ |
| مہیش پرشاد، پروفیسر | رقعاتِ غالب میں کانٹ چھانٹ | خدا بخش جرنل پٹنہ، ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۹۷ |
| مہیش پرشاد، پروفیسر | دیوانِ غالب اردو کے قلمی نسخے | خدا بخش جرنل پٹنہ، ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۱۲۶ |
| میر ولی اللہ | کلیم اور سلیم (دونوں شراب کے نشے میں)..... | خدا بخش جرنل پٹنہ، ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۶۶ |
| ناطق لکھنوی | قتل اور غالب | خدا بخش جرنل پٹنہ، ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۱۳۴ |
| نظامی بدایونی | روحِ کلامِ غالب | خدا بخش جرنل پٹنہ، ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۱۰۲ |

## سر سیّد اور علی گڑھ تحریک

| | | |
|---|---|---|
| آمنہ مشفق، پروفیسر | سر سیّد کے بارے میں چند نادر تحریریں | العلم، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۴ء ص ۳۹ |
| ابوالحسن، پروفیسر | ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ایک ہم عصر کی نظر میں | العلم، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۴ء ص ۷۶ |
| احتشام حسین پروفیسر | علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو | تہذیب الاخلاق، لاہور اکتوبر ۹۴ء ص ۲۸ |
| احمد رشید علیگ | سر سیّد اور جدید تعلیم | تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جولائی ۹۴ء ص ۳۴ |
| اصغر عباس | سر سیّد کے ابتدائی دس سال | تہذیب الاخلاق، لاہور اکتوبر ۹۴ء ص ۱۰ |
| ارشد مسعود گنگوہی | سر راس مسعود، علی گڑھ کا ایک مایہ ناز سپوت | تہذیب الاخلاق، لاہور جولائی ۹۴ء ص ۴ |
| الطاف حسین ندوی | سر سید اور مذہب | العلم، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۴ء ص ۳۲ |
| اویس جمال شمسی | مسلمانوں کا مسیحا سر سید | تہذیب الاخلاق، لاہور اکتوبر ۹۴ء ص ۱۶ |
| جان ڈیون پورٹ | لندن سے سر سید کے دو خط محسن الملک کے نام | خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۲۶۱ |
| جون ڈیون پورٹ | مؤید الاسلام | خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۲۶۳ |
| حامد علی خاں، ڈاکٹر | نامورانِ علی گڑھ، سید نا ابو محمد طاہر سیف الدین | تہذیب، کراچی نومبر ۹۴ء ص ۲۱ |

| | | |
|---|---|---|
| سر سید احمد خاں | تعلیم و تربیت | تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جولائی ۹۴ء ص ۶ |
| سر سید احمد خاں | عورتوں کے حقوق | تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اگست ۹۴ء ص ۸ |
| سر سیّد احمد خاں | اپنی مدد آپ | تہذیب الاخلاق، علی گڑھ ستمبر ۹۴ء ص ۴ |
| سیّد اقبال علی، مولوی | سر سیّد احمد خاں پنجاب میں | تہذیب، کراچی نومبر ۹۴ء ص ۱۱ |
| سیّد الطاف علی بریلوی | سر سیّد کی یاد میں | العلم، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۴ء ص ۲۷ |
| سید الطاف علی بریلوی | مسلم یونیورسٹی اور کانفرنس | العلم، کراچی جولائی ستمبر ۹۴ء ص ۵۹ |
| سیّد الطاف علی بریلوی | سر سیّد کا آنکھوں دیکھا حال | العلم، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۴ء ص ۴۹ |
| شہاب الدّین | سر سیّد مشاہیر کی نظر میں | العلم، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۴ء ص ۲۴ |
| شمس بدایونی، ڈاکٹر | علی گڑھ تحریک کے کارکن اور آل انڈیا مسلم ..... | العلم، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۴ء ص ۹۰ |
| ضیاء الدّین، لاہوری | حیاتِ سر سیّد سر سید کی خود نوشت سے اقتباس | تہذیب، کراچی نومبر ۹۴ء ص ۷ |
| ظفر الاسلام، ڈاکٹر | نواب محمد اسماعیل اور علی گڑھ | تہذیب الاخلاق، لاہور جولائی ۹۴ء ص ۲۷ |
| عبدالحلیم شرر | سر سیّد کی دینی برکتیں | خدا بخش جرنل پٹنہ ۸۱-۸۳/۹۳ء ص ۲۹۵ |
| عقیل احمد صدیقی | سر سیّد اور مسئلہ ثقافت | تہذیب الاخلاق، لاہور اکتوبر ۹۴ء ص ۱۹ |
| علی اختر خان، پروفیسر | سر سیّد کے تعلیمی تصورات | تہذیب الاخلاق، لاہور اکتوبر ۹۴ء ص ۶ |
| عنایت اللہ نعیم سہدروی، پروفیسر حکیم | قائداعظم اور علی گڑھ یونیورسٹی | تہذیب الاخلاق، لاہور دسمبر ۹۴ء ص ۱۸ |
| محمد اشرف، ڈاکٹر | سیّد احمد کے علی گڑھ کی سیاسی زندگی | تہذیب الاخلاق، لاہور اکتوبر ۹۴ء ص ۳۳ |
| محمد عزیز، ڈاکٹر | سر سیّد کی شوخی و ظرافت | تہذیب الاخلاق، لاہور اکتوبر ۹۴ء ص ۲۲ |
| مرتضیٰ حسین بلگرامی | سر سیّد اور میر ولایت حسین | تہذیب الاخلاق، لاہور جولائی ۹۴ء ص ۱۷ |
| مرزا علی اظہر برلاس | سر راس مسعود، علو مرتبہ اور خدمات | العلم، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۴ء ص ۶۸ |
| مسعود عالم، پروفیسر | مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کچھ باتیں کچھ حقیقتیں | تہذیب الاخلاق، علی گڑھ ص ۳ |
| مظفر عباس نقوی، پروفیسر | سر سیّد اور مولانا وحید الدّین سلیم | تہذیب الاخلاق، لاہور جولائی ۹۴ء ص ۱۱ |
| نفیس بانو | علی گڑھ اور نواب سلطان جہاں بیگم | تہذیب الاخلاق، لاہور جولائی ۹۴ء ص ۳۲ |
| نورالحسن جعفری | | |
| صدر انجمن ترقی اردو پاکستان | روایات علی گڑھ | قومی زبان، کراچی اگست ۹۴ء ص ۸۱ |
| ولی مظہر | سر سیّد احمد خاں اور قومی صحافت | العلم، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۴ء ص ۶۴ |
| یٰسین مظہر صدیقی | سر سیّد کے مذہبی تصورات | تہذیب الاخلاق، لاہور اکتوبر ۹۴ء ص ۴ |
| یٰسین نوری، بیرسٹر | سر سیّد جن کا اثر مجھ پر ہوا | تہذیب الاخلاق، لاہور اکتوبر ۹۴ء ص ۲۴ |

## اقبالیات

| | | |
|---|---|---|
| آفتاب احمد نقوی، ڈاکٹر | اقبال اور سیّد سلیمان ندوی | محفل، لاہور نومبر ۹۴ء ص ۳۵ |
| ابوالحسن علی ندوی، مولانا | مسجدِ قرطبہ | نگار پاکستان، کراچی جولائی ۹۴ء ص ۵ |

| | | |
|---|---|---|
| ابوالحسن علی ندوی، مولانا | عورت، اقبال کے کلام میں | تفکر، لاہور دسمبر ۹۴ء ص ۲۸ |
| ارشاد شاکر اعوان | علامہ اقبال اور پاکستان اسکیم | صحیفہ، لاہور جنوری مارچ ۹۴ء ص ۱۳ |
| ارشد میر | علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط | نقوش، لاہور ۱۳۹/۹۴ء ص ۶۴۴ |
| اسرار احمد سہاوری، پروفیسر | مغرب پر اقبال کی تنقید | محفل، لاہور نومبر ۹۴ء ص ۸۷ |
| اسلوب احمد انصاری، پروفیسر | مسجد قرطبہ | نگار، کراچی جولائی ۹۴ء ص ۳۷ |
| اکبر حیدری کشمیری | اقبال کی ایک نظم فاطمہ بنت عبداللہ اور الہلال، | صحیفہ، لاہور جولائی ستمبر ۹۳ء ص ۲۶ |
| اکرام چغتائی | اقبال اور ہزار داستان | صحیفہ، لاہور اکتوبر دسمبر ۹۳ء ص ۵ |
| الطاف رسول | علامہ اقبال کا ایک نایاب مکتوبِ گرامی..... | خدا بخش جرنل پٹنہ ۸۱-۸۳/۹۳ء ص ۳۱۵ |
| اُم سلمٰی، ڈاکٹر | علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف واقعات | اردو نامہ لاہور نومبر ۹۴ء ص ۳۰ |
| انور سدید، ڈاکٹر | اقبال کی نگاہ میں عورت | قومی زبان، کراچی نومبر ۹۴ء ص ۵ |
| بشیر النساء بیگم بشیر | اقبال اور اکیسویں صدی | اقبالیات، لاہور جولائی ستمبر ۹۴ء ص ۱۷ |
| تحسین فراقی، ڈاکٹر | اقبال اور ہم | اقبال، ریویو حیدر آباد دکن اپریل ۹۳ء ص ۷۷ |
| حاتم رامپوری، ڈاکٹر | کلیاتِ مکاتیب اقبال، جلد سوم، ایک جائزہ | اقبالیات، لاہور جولائی ستمبر ۹۴ء ص ۲۴۷ |
| حبیب اللہ اوج | مسجدِ قرطبہ | نگار، کراچی جولائی ۹۴ء ص ۶۱ |
| خلیفہ عبدالحکیم | دفتری نظام میں انقلاب، ٹیلی کمیونٹنگ | تہذیب الاخلاق، لاہور جولائی ۹۴ء ص ۴۵ |
| رحمت یوسف زئی، ڈاکٹر | اقبال، حالات اور شاعری | تہذیب الاخلاق، لاہور نومبر ۹۴ء ص ۳۲ |
| رفاقت علی شاہد | کلام اقبال میں صناعی | اقبال، ریویو حیدر آباد دکن نومبر ۹۲ء ص ۸۰ |
| رفاقت علی شاہد | اردو غزل اور بالِ جبریل | قومی زبان، کراچی نومبر ۹۴ء ص ۲۵ |
| رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر | جہاتِ اقبال پر ایک نظر | سیارہ، لاہور دسمبر ۹۴ء ص ۱۸۶ |
| رفیع الدین ہاشمی | علامہ اقبال اور نظام عالم کی تشکیل جدید | اقبال، ریویو حیدر آباد دکن نومبر ۹۲ء ص ۴۱ |
| رفیع الدین ہاشمی | مسجدِ قرطبہ | اقبال، ریویو حیدر آباد دکن نومبر ۹۳ء ص ۳ |
| سراج الدین، پروفیسر | اقبالیاتی ادب کے تین سال ۱۹۸۷ء-۱۹۸۹ء | اقبالیات، لاہور جولائی ستمبر ۹۴ء ص ۱۹۱ |
| سلیمان سکندر، مولانا | اقبال کی اردو غزل | اقبال ریویو حیدر آباد دکن نومبر ۹۳ء ص ۷ |
| سید خلیل اللہ حسینی | بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من،..... | اقبال، ریویو حیدر آباد دکن اپریل ۹۳ء ص ۱۲۵ |
| سید خلیل اللہ حسینی | اگر خواہی حیات اندر خطر زی | اقبال ریویو حیدر آباد دکن اپریل ۹۳ء ص ۲۲ |
| سید خلیل اللہ حسینی | اک مردِ قلندر نے کیا راز خودی فاش | اقبال ریویو حیدر آباد دکن اپریل ۹۳ء ص ۳۲ |
| سید خلیل اللہ حسینی | سوئے قطار می کشم | اقبال، ریویو حیدر آباد دکن اپریل ۹۳ء ص ۳۵ |
| سید خلیل اللہ حسینی | پیامِ اقبال | اقبال، ریویو حیدر آباد دکن اپریل ۹۳ء ص ۱۲۱ |
| سید ظفر الحسن، ڈاکٹر | خطبہ صدارت، تشکیل جدید الہیاتِ اسلامیہ | اقبالیات، لاہور جولائی ستمبر ۹۴ء ص ۱۵۱ |
| سید محمد یوسف | مسجدِ قرطبہ تاریخ کی روشنی میں | نگار، کراچی جولائی ۹۴ء ص ۶۹ |

| | |
|---|---|
| شائستہ خان | اقبال کا ایک نادر خط |
| شفیقہ اختر | اقبال، وائلڈ اور فلسفہ وجودیت |
| صابر کلوروی، ڈاکٹر | مکاتیبِ اقبال کی سات تاریخوں کا مسئلہ |
| طارق غازی | ابنِ خلدون اور اقبال |
| ظہیر الدّین احمد | ذوق و شوق، ایک مطالعہ |
| ظہیر الدّین احمد | پروفیسر غلام دستگیر رشید، ایک صاحبِ..... |
| عاصم قادری | اقبال کے فکر و فن کا حقیقی سرچشمہ |
| عالم خوندمیری، پروفیسر | مسجدِ قرطبہ |
| علی ظہیر | جدید اردو شعراء پر اقبال کا اثر |
| عمیق حنفی | اقبال کی مسجدِ قرطبہ |
| کریم رضا | ہندوستان میں مطالعۂ اقبال |
| کلیم اختر | علامہ اقبال، دوسری گول میز کانفرنس اور تحریکِ کشمیر |
| م۔ ندیم (علیگ) | علامہ اقبال اور رشید احمد صدیقی |
| مختار زمن | سر شاہ محمد سلیمان، مبصّرِ ادب |
| مسعود حسین خان، پروفیسر | مسجدِ قرطبہ |
| مصلح الدّین سعدی | ملتِ ختمِ رسل ﷺ شعلہ بہ پیراہن ہے |
| مظفر حسین برنی | علامہ اقبال کے ایک نئے مکتوب الیہ |
| معین الدّین عقیل، ڈاکٹر | اقبال کے دو غیر مدوّن خط |
| مغنی تبسم، ڈاکٹر | اقبال کے نظریۂ فن کے بارے میں چند..... |
| ملک حسن اختر | مسجدِ قرطبہ |
| نظر زیدی | علامہ اقبال |
| نیلم سیّد | اقبال کی شاعرانہ عظمت |
| وحید عشرت، ڈاکٹر | خطبہ علامہ اقبال، علم اور مذہبی مشاہدہ (۱) |
| وحید عشرت، ڈاکٹر | علامہ اقبال اور تہذیب کا روحانی مقصود |
| وحید قریشی، ڈاکٹر | اقبال کا تصورِ تعلیم اور عصری صورتِ حال |

## مولانا عبید اللہ سندھی

| | |
|---|---|
| ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر | مکاتیبِ مولانا عبید اللہ سندھی |
| ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر | مولانا سندھی اور کمیونزم |
| خدا بخش | یادگارِ اسلاف، امام انقلاب مولانا سندھی |
| غلام مصطفےٰ قاسمی، علامہ | میرے شیخ علامہ عبید اللہ |

قومی زبان، کراچی نومبر ۹۴ء ص ۱۷
اقبالیات لاہور جولائی ستمبر ۹۴ء ص ۵۳
اقبالیات، لاہور جولائی ستمبر ۹۴ء ص ۷
اقبال، ریویو حیدر آباد دکن نومبر ۹۲ء ص ۲۰
اقبال، ریویو حیدر آباد دکن اپریل ۹۳ء ص ۵۵
اقبال، ریویو حیدر آباد دکن اپریل ۹۳ء ص ۹۵
محفل، لاہور نومبر ۹۴ء ص ۲۷
نگار، کراچی جولائی ۹۴ء ص ۷۶
اقبال، ریویو حیدر آباد دکن نومبر ۹۲ء ص ۷۲
نگار، کراچی جولائی ۹۴ء ص ۱۶
اقبال، ریویو حیدر آباد دکن نومبر ۹۲ء ص ۸۷
اقبالیات، لاہور جولائی ستمبر ۹۴ء ص ۹۱
نقوش، لاہور ۱۳۹/۹۴ء ص ۶۵۰
قومی زبان، کراچی نومبر ۹۴ء ص ۳۵
نگار، کراچی جولائی ۹۴ء ص ۵۰
اقبال، ریویو حیدر آباد دکن نومبر ۹۲ء ص ۶۶
نقوش، لاہور ۱۳۹/۹۴ء ص ۶۲۹
اقبال ریویو حیدر آباد دکن اپریل ۹۳ء ص ۷۰
اقبال، ریویو حیدر آباد دکن نومبر ۹۲ء ص ۵۷
اقبال، ریویو حیدر آباد دکن نومبر ۹۳ء ص ۳۰
تہذیب الاخلاق، لاہور نومبر ۹۴ء ص ۸
قومی زبان، کراچی نومبر ۹۴ء ص ۳۱
اقبالیات، لاہور جولائی ستمبر ۹۴ء ص ۱۲۳
اقبال، ریویو حیدر آباد دکن اپریل ۹۳ء ص ۳۷
اقبالیات لاہور جولائی ستمبر ۹۴ء ص ۱۰۵

قومی زبان، کراچی ستمبر ۹۴ء ص ۳۳
الولی، حیدر آباد اگست ستمبر ۹۴ء ص ۹۱
الولی حیدر آباد اگست ستمبر ۹۴ء ص ۴۱
الولی، حیدر آباد سندھ اگست ستمبر ۹۴ء ص ۵

غلام مصطفیٰ قاسمی، علامہ — افادات حضرت مولانا عبید اللہ — الولی، حیدر آباد سندھ اگست ستمبر ۹۴ء ص ۱۱
غلام مصطفیٰ قاسمی، علامہ — امام انقلاب حضرت علامہ سندھی — الولی، حیدر آباد سندھ اگست ستمبر ۹۴ء ص ۲۸
قاضی محمد زاہد الحسینی، مولانا — امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی ..... — الولی، حیدر آباد سندھ اگست ستمبر ۹۴ء ص ۸۷
محمد منظور نعمانی، مولانا — مولانا عبید سندھی کے ساتھ چار روز — الولی، حیدر آباد اگست ستمبر ۹۴ء ص ۸۱

## بابائے اُردو

افتخار اجمل شاہین — بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق تحقیق کے آئینے میں — قومی زبان، کراچی اگست ۹۴ء ص ۴۱
جگن ناتھ آزاد، پروفیسر — مولوی عبدالحق یادوں کے آئینے میں — قومی زبان، کراچی اگست ۹۴ء ص ۱۷
سید منظور احمد — بابائے اردو اور حکیم محمد امام امامی — قومی زبان، کراچی اگست ۹۴ء ص ۲۳
محمد ظفیر الحسن، ڈاکٹر — بابائے اردو کا سفرِ اردو ۱۹۴۵ء — قومی زبان، کراچی اگست ۹۴ء ص ۳۵
ممتاز حسین، پروفیسر — مولوی عبدالحق — قومی زبان، کراچی اگست ۹۴ء ص ۵۲
نثار احمد فاروقی، پروفیسر — مولوی عبدالحق کا اسلوب — قومی زبان، کراچی اگست ۹۴ء ص ۵

## مولانا ابوالکلام آزاد

ابوالکلام آزاد، مولانا — مرزا غالب کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ — خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۷۵
ابوالکلام آزاد، مولانا — فتنہ ارتداد اور مسلمان — خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۸-۸۰/۹۲ء ص ۲۹۱
ابوالکلام آزاد، مولانا — مکتوبِ آزاد بنام سید سلیمان ندوی — خدا بخش جرنل پٹنہ ۸۱-۸۳/۹۳ء ص ۳۳۹

## ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

خلیل احمد — ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ایک شاگرد کی نظر میں — العلم، کراچی جولائی ستمبر ۹۴ء ص ۱۰۰
رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر — ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی اقبال شناسی — مجلہ تحقیق جامعہ سندھ ۹۱/۵ء ص ۲۳۹
غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر — شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے مکتوبات — مجلہ تحقیق جامعہ سندھ ۹۱/۵ء ص ۱۷۲
غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر — حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ — نقوش، لاہور ۹۴/۱۳۹ء ص ۱۱۶
غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر — ہمارا معاشرہ اور عربی — اخبار اردو اسلام آباد اکتوبر ۹۴ء ص ۲۱

(باقی)

## انجمن ترقی اردو پاکستان کی تازہ ترین مطبوعات

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1. مشاہیر یونان و روما (جلد پنجم) | پلوٹارک | سید ہاشمی فرید آبادی | 110/= |
| 2. مرقع اقوال و امثال | | یوسف بخاری دہلوی | 450/= |
| 3. جدید اُردو شاعری (حصہ دوم) | | عزیز حامد مدنی | 175/= |
| 4. زبانِ واحد | میرین مالٹینو | صفیہ صدیقی | 100/= |
| 5. چینی لوک کہانیاں | | شفیع عقیل | 100/= |
| 6. سیف الملوک | | شفیع عقیل | 150/= |
| 7. پنجابی کے پانچ قدیم شاعر | | شفیع عقیل | 90/= |
| 8. بیاضِ مرائی | | افسر صدیقی امروہوی | 75/= |
| 9. اُردو تنقید کا ارتقا | | ڈاکٹر عبادت بریلوی | 150/= |
| 10. وضع اصطلاحات | | مولوی وحید الدین سلیم | 110/= |

انجمن ترقی اُردو پاکستان

ڈی 159۔ بلاک 7۔ گلشن اقبال کراچی۔ 75300

## چینی لوک کہانیاں

(دوسرا ایڈیشن)

شفیع عقیل

صفحات: ۳۲۸

قیمت: =/۱۰۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

اُردو

قومی یکجہتی اور پاکستان

از

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

مقدمہ

جمیل الدّین عالی

قیمت: =/۶۰ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو پاکستان ڈی ۱۵۹ بلاک ۷ گلشن اقبال کراچی

انجمن ترقی اُردو پاکستان

کی

تمام مطبوعات

مکتبۂ دانیال وکٹوریہ چیمبرز۔۲۔ عبداللہ ہارون روڈ، کراچی سے طلب فرمائیے۔

شیل ۔ ایک قابلِ اعتماد نام

R-LINTAS

Regd M. No. 270
Monthly QAUM

قو

عمارت کا نقشہ

ایک خواب
جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر: ادیب سہیل طابع: فضلی سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ کراچی مقام اشاعت ... بلاک (۵) گلشن اقبال کراچی